فہرست

شذرات	قوم کی رہنمائی کا صحیح راستہ	ریحان احمد یوسفی	۲
قرآنیات	آل عمران (۳: ۷۷۔۸۰)	جاوید احمد غامدی	۷
معارف نبوی	لہسن، پیاز جیسی سبزیوں کو کھانے سے پہلے ان کی بو ختم کرنا	معز امجد	۱۱
	حرمت جان کی شرط	طالب محسن	۱۶
	نماز کے اوقات ـــــ ظہر میں تاخیر	ساجد حمید	۱۹
دین و دانش	اخلاقیات (۶)	جاوید احمد غامدی	۲۷
نقطۂ نظر	الحاد جدید کے مغربی اور مسلم دنیا پر اثرات	محمد مبشر نذیر	۳۳
حالات و وقائع	سلیمان بن یسار	محمد وسیم اختر مفتی	۶۱
	قاسم بن محمد	" "	۶۴
ادبیات	سورۂ اقرا ـــــ منظوم ترجمانی	مرزا آصف رسول	۷۱

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

قوم کی رہنمائی کا صحیح راستہ

قتل انسانیت کے خلاف کیا جانے والا سب سے بڑا جرم ہے، لیکن یہ جرم کبھی اسباب کے بغیر جنم نہیں لیتا۔ فطرت انسانی میں جان کی حرمت کا احساس اتنا غیر معمولی ہے کہ عام حالات میں ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ جب کبھی یہ جرم سرزد ہوتا ہے تو اسباب و محرکات کی ایک دنیا اس کے پیچھے موجود ہوتی ہے۔ یہ کبھی غصہ وانتقام سے جنم لیتا ہے۔ کہیں حرص وہوس کی آگ اس کا باعث بنتی ہے اور بسااوقات مال وزر کی طلب اس کا محرک بن جایا کرتی ہے۔

قتل کا یہ جرم ایک انسان جب اپنے خلاف کرتا ہے تو صورت حال زیادہ سنگین ہو جاتی ہے۔ دوسروں کا قتل معاشرے میں صبر وتحمل کے فقدان کی علامت ہے تو اپنا قتل ذہنی تناؤ اور مایوسی کا ایک غیر معمولی اظہار ہوتا ہے۔ اپنے قتل سے زیادہ بھیانک جرم اپنے پیاروں کا قتل ہے۔ اپنوں کے خلاف قتل کا اقدام، معاشرے میں برداشت اور امید کے خاتمے کا ایک ایسا صریح اعلان ہے جس کے بعد کسی دوسرے اعلان کی ضرورت نہیں رہتی۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے رہنے والے قتل وغارت گری اور خودکشی کی خبروں کے تو بہت عادی ہو چکے تھے کہ اب باپ کے ہاتھوں اولاد کے قتل کی خبروں نے ہر شخص کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ شہر کراچی میں ماہ اپریل کے دس دنوں میں ایسے تین واقعات ہوئے۔ پہلے واقعے میں ایک اسکول ٹیچر نے اپنے تین بچوں کو ذبح کر دیا۔ دوسرے واقعے میں ایک باپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کو مار ڈالا اور آخری واقعے میں ایک باپ کے ہاتھوں دو نوعمر بچیاں ذبح ہو گئیں۔

ان واقعات نے ہر صاحب دل کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ لوگ سوال کر رہے ہیں کہ یہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ قتل کرنے

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

والوں سے جب پوچھا جاتا ہے تو وہ غربت و افلاس اور ذہنی پریشانی کو اپنے اس سفاکانہ اقدام کا سبب بتاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات اسے مایوسی کا آخری مقام قرار دیتے ہیں۔ ماہرین معیشت کے نزدیک یہ چارسو پھیلی غربت کا نتیجہ ہے، جبکہ ماہرین سماجیات جہالت کو ایسے واقعات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

یہ تجزیے بڑی حد تک ٹھیک ہیں۔ ہمارا معاشرہ غربت اور جہالت کے شکنجے میں بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ معاشی ترقی جو کچھ ہو رہی ہے، اس کے اثرات ایک خاص طبقے تک محدود ہیں۔ مڈل کلاس کو اس ترقی کی اطلاع بذریعہ اخبار مل بھی جاتی ہے، مگر غربا کے پاس اخبار خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ وہ ترقی کی اس اطلاع ہی کو سن کر خوش ہو جائیں۔ وہ ایک طرف اپنی جائز ضروریات پوری کرنے سے بھی قاصر ہیں تو دوسری طرف نت نئی گاڑیوں اور عالی شان مکانات کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ان حالات میں مایوسی کا پیدا ہونا ایک قدرتی عمل ہے۔ یہ مایوسی ذہنی تناؤ کو جنم دیتی ہے جو لوگوں کی اکثریت کے لیے ذہنی اور جسمانی عوارض کا سبب بنتی ہے، جبکہ ایک اقلیت کے لیے جرائم، خودکشی اور قتل اولاد کا محرک بن جاتی ہے۔

ہمارے نزدیک معاشرے میں پھیلی اس مایوسی کا سبب غربت اور تنگ دستی ہی نہیں، بلکہ منفی اندازفکر کا وہ بیج بھی ہے جو عرصے سے قوم کے ذہن میں بویا جا رہا ہے۔ کسی معاشرے کے حالات صرف سیاسی قیادت کے اعمال ہی کا نتیجہ نہیں ہوتے، بلکہ فکری اور مذہبی لیڈرشپ بھی معاشرے کے خیر و شر کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ پاکستان میں غربت و جہالت کے ذمہ دار اگر سیاسی لوگ ہیں تو قوم کو منفی اندازفکر دینے والے لوگ وہ ہیں جو معاشرے میں مذہبی اور بالخصوص فکری قیادت کے منصب پر فائز ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آپ کبھی ان لوگوں کو پڑھیں یا سنیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں اب کہیں بھلائی نہیں رہی۔ یہاں ہر طرف ہمارے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ دنیا میں ہر شخص ہمارا دشمن ہے۔ ہر طرف لٹیروں اور راہ زنوں کا راج ہے۔ ہر فرد صرف تاریکیاں بکھیرنے اور کانٹے بونے میں مشغول ہے۔ خیر کا کوئی امکان باقی نہیں ہے۔ ہمارے معصوم لیڈر شاید یہ سوچ کر اس طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ ان کی گفتگو سے احتجاج کا وہ طوفان برپا ہو جائے گا جو سارے معاملات کو درست کر دے گا۔ انقلاب کی وہ عوامی لہر اٹھے گی جو ہر ظالم و بد کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گی، مگر بدقسمتی سے یہ لوگ نہیں جانتے کہ خدا کی دنیا کن اصولوں پر چلتی ہے، انسانی نفسیات کس طرح چیزوں کا اثر قبول کرتی ہے، معاشرے میں تبدیلی کے اصول کیا ہوتے ہیں۔

ان کی اس بے خبری کا نتیجہ قوم کے حق میں یہ نکلا کہ معاملات سدھرنے کے بجائے بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ

جو کچھ پانا چاہتے تھے، وہ تو نہ ملا، الٹا جو گرہ میں تھا، وہ بھی گیا۔ معاشرے میں خیر وصلاح کی روش تو نہ پھیلی، جو کچھ اخلاق حمیدہ کا سرمایہ اپنے پاس تھا، اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ قوم کے اندر ایک منفی ذہن پروان چڑھنا شروع ہوا۔ احتجاج اور غصہ کی نفسیات نے جنم لیا۔ مایوسی اور ذہنی تناؤ نے ہر گھر کو اپنا اسیر کر لیا۔

اس کے برعکس جب کسی قوم میں ایک مثبت ذہن پیدا کیا جاتا ہے: لینے کا نہیں دینے کا ذہن، حقوق کا نہیں فرائض کا ذہن، دوسروں کو تلقین کا نہیں اپنی اصلاح کا ذہن، احتجاج وشکایت کا نہیں صبر وبرداشت کا ذہن، دنیا میں جنت کی تعمیر کا نہیں، آخرت کی ابدی فلاح کا ذہن۔ یہ ذہن جب جب پیدا کیا جاتا ہے تو اپنے دامن میں خیر کے سوا کچھ نہیں لاتا۔

ہماری فکری قیادت کی تو یہ زیادہ ذمہ داری تھی اور ہے کہ وہ لوگوں میں یہ مثبت انداز فکر پیدا کریں، کیونکہ ہمارے ہاں فکری قیادت کا زیادہ تر کام مذہبی لوگوں نے کیا ہے۔ ان سے بڑھ کر کس کو یہ بات جاننی چاہیے کہ یہ مثبت ذہن خدا اور آخرت پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ آخرت پر ایمان آدمی کو یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیا کھونے اور پانے کی جگہ نہیں امتحان کی دنیا ہے اور اچھے برے سب حالات خدا کی طرف سے انسانوں کی آزمایش کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔ انسان جیسے ہی اس رخ سے پوری صورت حال کو دیکھتا ہے، اس کا ذہن بدل جاتا ہے۔ زمانے کے سرد وگرم میں اس کی توجہ حالات سے زیادہ اپنے اس ردعمل کی طرف رہتی ہے جو وہ ان حالات میں ظاہر کرتا ہے۔ نعمت میں شکر اور مصیبت میں صبر کی وہ روش بندۂ مومن کے قول وفعل سے ظاہر ہوتی ہے جو دنیا وآخرت، دونوں کی فلاح کی ضامن ہے۔

دوسری طرف خدا پر ایمان انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونے دیتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ خدا سے یہ حسن ظن زندگی کی ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔ پھر ہر رات صبح میں ڈھل جاتی ہے۔ ہر تاریکی روشنی میں بدل جاتی ہے ـــــ جب امید کی ہر کرن دم توڑ دے، اسباب کا ہر راستہ بند ہو جائے، امکان کا ہر گوشہ تاریک ہو جائے تب بھی رب العالمین کی ذات پر بھروسا، اس پر اعتماد، اس کا یقین اور سب سے بڑھ کر اس کی رحمت بندۂ مومن کا وہ سہارا ہوتی ہے جس کی بنیاد پر انسان ہر طوفان سے ٹکرا جاتا ہے۔ وہ ہر تاریکی کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ بدترین حالات میں بھی جینے کا ڈھنگ سیکھ لیتا ہے۔ مشکل ترین صورت حال کا سامنا اس حوصلے سے کرتا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتے ہیں، مگر بندۂ مومن کا اپنے رب پر یقین اس کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتا۔ یہی وہ بات ہے جو اقبال نے اس طرح کہی تھی:

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے

امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

آج بھی اگر اس قوم تک کوئی پیغام پہنچنا چاہیے تو وہ یہی ہے۔ اس قوم کو کسی نظریہ سازش کی ضرورت نہیں۔ اسے خدا اور آخرت پر سچا ایمان چاہیے۔ وہ ایمان جو اس میں مثبت ذہن پیدا کرے اور بدترین حالات میں بھی اس کی امید ٹوٹنے نہ دے۔ جو لیڈر یہ کام کرے گا، وہی اس قوم کا حقیقی خادم ہوگا۔ جو لوگ یہ کام نہیں کریں گے، وہ اپنے اخلاص کے باوجود قوم کے حق میں برا ہی کریں گے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۱۷)

(گزشتہ سے پیوستہ)

اِنَّ الَّـذِيْـنَ يَشْتَـرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ ، وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا، اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ ، وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ ، وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ، وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ، وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

(اِس کے برخلاف) جو لوگ اللہ کے عہد[۱۴۴] اور اپنی قسموں[۱۴۵] کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں، اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اور اللہ قیامت کے دن نہ اُن سے بات کرے گا، نہ اُن کی طرف نگاہ التفات سے دیکھے گا اور نہ اُنھیں (گناہوں سے) پاک کرے گا،[۱۴۶] بلکہ (وہاں) اُن کے لیے ایک دردناک سزا ہے[۱۴۷]۔ ۷۷

[۱۴۴] اس سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ کی شریعت اور آخری بعثت سے متعلق یہود سے لیا گیا تھا۔

[۱۴۵] یعنی وہ قسمیں جو انھوں نے اللہ کے نبیوں، بالخصوص نبی امی پر ایمان اور ان کی تائید و نصرت کا عہد کرتے وقت کھائی تھیں۔ آیت ۸۱ میں ان کے اس عہد اور ان قسموں کا ذکر آئے گا۔

[۱۴۶] مطلب یہ ہے کہ ان کے جرائم ایسے نہیں ہیں کہ تھوڑی بہت سزا دے کر اللہ انھیں پاک کر دے، بلکہ ایسے سخت ہیں کہ ان کی سزا ہمیشہ کی دوزخ ہی ہو سکتی ہے۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ ، لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ ، وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ، وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ، وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰه ، وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ، وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٨﴾

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ ، وَالْحُكْمَ ، وَالنُّبُوَّةَ ، ثُمَّ يَقُوْلَ

اور اِن میں وہ لوگ بھی ہیں کہ اللہ کی کتاب کو پڑھتے ہوئے اپنی زبان کو اس طرح توڑتے مروڑتے ہیں کہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں، وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، دراں حالیکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، دراں حالیکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا، اور (اِس طرح) جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔[۱۴۸] ۷۸

(پھر یہی نہیں، وہ اللہ کے پیغمبر پر بھی جھوٹ باندھتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ) کسی انسان کی یہ

---

[۱۴۷] آیت کے الفاظ میں یہود کے لیے کتنی نفرت اور کیسی شدید بے زاری چھپی ہوئی ہے، اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو الفاظ کے تیور کچھ پہچانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو حیثیت انھیں دی اور اس کے لحاظ سے جو معاملہ ان کے ساتھ کیا، اس کے بعد یہ اسی کے سزاوار تھے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ انھیں دیکھنے کے بعد کسی شخص کو اس پر تعجب نہیں ہو سکتا۔

[۱۴۸] یہ ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر کا ذکر ہے جو اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے اختیار کر رکھی تھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس جرم کا ارتکاب یہود و نصاریٰ، دونوں ہی نے کیا ہے۔ اس کی مثال میں ہم نے لفظ ”مروہ“ کا ذکر کیا ہے۔ یہ لفظ تورات میں حضرت ابراہیم کی سرگزشت کے سلسلہ میں آیا ہے کہ اس مقام پر ان کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا۔ یہود نے اس قربانی کے واقعے میں جہاں کمی اور بیشی کی نوعیت کی بہت سی تبدیلیاں کی ہیں، وہیں لفظ مروہ کی قرأت کو بگاڑ کر مریا، موریا، موریاہ، مورہ اور نہ جانے کیا کیا بنایا تاکہ مکہ کی مشہور پہاڑی مروہ کے بجائے اس سے بیت المقدس کے کسی مقام کو مراد لے سکیں اور اس طرح حضرت ابراہیم اور ان کی ہجرت و قربانی کے واقعہ کا تعلق بیت اللہ سے بالکل کاٹ دیں۔ مقصد اس ساری کاوش سے ان کا یہ تھا کہ اس ایر پھیر سے ان پیشین گوئیوں اور اشارات کا رخ موڑا جا سکے جو بنی اسماعیل اور ان کے اندر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات کے صحیفوں میں وارد تھیں۔“ (تدبر قرآن ۲/۱۲۸)

لِلنَّاسِ : كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ، وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ
تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ ، وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا
الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ، اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾

شان نہیں ہے کہ اللہ اُس کو اپنی کتاب دے اور (اُس کے مطابق) فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور نبوت عطا فرمائے ، پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ (نہیں)، بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ لوگو)، اللہ والے بنو،[149] اِس لیے کہ تم اللہ کی کتاب پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ اور نہ وہ تم سے یہ کہے گا کہ فرشتوں اور نبیوں کو اپنا رب بنا لو۔ تمھارے مسلمان ہو چکنے کے بعد کیا وہ تمھیں کفر اختیار کر لینے کا حکم دے گا؟[150] ۷۹۔ ۸۰

---

[۱۴۹] اصل میں لفظ 'ربٰنیین' آیا ہے۔ یہ 'ربانی' کی جمع ہے جس کے معنی خدا پرست اور اللہ والے کے ہیں۔ عربی زبان میں یہ لفظ عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

[۱۵۰] یہ اب عقل سلیم کو مخاطب کر کے قرآن نے اپنے تمام مخاطبین یہود و نصاریٰ، بلکہ قریش مکہ کو بھی توجہ دلائی ہے کہ جن توہمات کو وہ اپنے عقائد بنائے ہوئے ہیں، ان کی نسبت ان کے جلیل القدر پیغمبروں سے ہرگز درست نہیں ہے۔ اللہ کا کوئی پیغمبر بھی ایمان و اسلام کی دعوت دینے کے بعد اپنے پیرووں کو کفر و شرک میں جھونک دینے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی کوئی چیز جہاں نظر آئے، سمجھ لینا چاہیے کہ یہ گمراہ کن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔ اسے کسی پیغمبر کی دعوت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معز امجد

لہسن، پیاز جیسی سبزیوں کو کھانے سے پہلے ان کی بو ختم کرنا

ر[1]وی أن النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم نهی عن هاتین الشجرتین[2] وقال: من أكلهما فلا يقربن مسجدنا . وقال : إن كنتم لا بد من آكليهما فأميتوهما طبخا[3]. قال: يعنی: البصل و الثوم.

”روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو پودوں (یعنی لہسن اور پیاز کھانے) سے (لوگوں کو) روکا اور فرمایا: جو انھیں کھائے، اسے چاہیے کہ وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: تمھیں اگر انھیں کھانا ہی ہے تو پہلے انھیں پکا کر ان کی بو ختم کر لیا کرو۔

راوی کا کہنا ہے کہ (ان دو پودوں سے) آپ کی مراد لہسن اور پیاز ہے[1]۔“

ترجمے کے حواشی

ا۔ اس روایت کا مضمون اس باب کی دوسری روایات میں وضاحت سے بیان ہو چکا ہے۔

متن کے حواشی

ا۔ یہ ابوداؤد کی روایت، رقم ۳۸۲۷ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

ترمذی، رقم ۱۸۰۸، ۱۸۰۹۔ ابوداؤد، رقم ۳۸۲۸۔ سنن الکبریٰ، رقم ۶۶۸۱۔ بیہقی، رقم ۴۸۴۴۔ احمد بن حنبل، رقم ۱۶۲۹۲۔

۲۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۶۲۹۲ میں 'هاتين الشجرتين' (یہ دو درخت) کے الفاظ 'الخبيثتين' (مکروہ) کے لفظ کے اضافے کے ساتھ روایت ہوئے ہیں۔

۳۔ بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۸۲۸ میں یہ مضمون یوں روایت ہوا ہے: 'نهى عن أكل الثوم إلا مطبوخا' (لہسن کھانے سے منع کیا ہے، مگر یہ کہ وہ پکایا ہوا ہو)، جبکہ ترمذی، رقم ۱۸۰۹ میں 'نهى عن أكل الثوم' (لہسن کھانے سے منع کیا ہے) کے بجائے 'لا يصلح أكل الثوم' (یہ مناسب نہیں ہے کہ لہسن کھایا جائے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

مندرجہ بالا روایت کا مضمون حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبۂ جمعہ کے حصے کے طور پر بھی روایات میں نقل ہوا ہے:

روى أن عمر بن الخطاب خطب الناس يوم الجمعة وذكر نبى الله وقال فيه: إنكم أيها الناس تأكلون شجرتين لا أراهما إلا خبيثتين هذا البصل والثوم لقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا وجد ريحهما من الرجل فى المسجد أمر به فأخرج إلى البقيع فمن أكلهما فليمتهما طبخا.

''روایت ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ جمعے کے دن لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کیا اور کہا: لوگو، تم دو پودے ایسے کھاتے ہو جنھیں میں مکروہ سمجھتا ہوں۔ یہ پودے لہسن اور پیاز ہیں۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ جب آپ مسجد میں کسی سے ان کی بو محسوس کرتے تو آپ اسے بقیع کی طرف نکل جانے کا حکم دیتے۔ چنانچہ جو کوئی یہ پودے کھائے، اسے چاہیے کہ انھیں پکا کر ان کی بو ختم کر لے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ مسلم کی روایت، رقم ۵۶۷ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

ابن ماجہ، رقم ۱۰۱۴، ۳۳۶۳۔ نسائی، رقم ۷۰۸۔ ابن حبان، رقم ۲۰۹۱۔ ابن خزیمہ، رقم ۱۶۶۶۔ احمد بن حنبل، رقم ۸۹، ۳۴۱۔ سنن الکبریٰ، رقم ۷۸۷، ۶۶۸۲، ۶۶۸۴۔ بیہقی، رقم ۴۸۴۳، ۱۶۳۵۵۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۸۶۵۸، ۲۴۴۸۸، ۳۷۰۶۲۔ ابویعلیٰ، رقم ۱۸۴، ۲۵۶۔ حمیدی، رقم ۱۰۔

بعض روایات مثلاً سنن الکبریٰ، رقم ۶۶۸۴ میں 'إنكم أيها الناس تأكلون شجرتين لا أراهما إلا

خبیثتین‘(لوگو،تم دو پودے ایسے کھاتے ہو جنھیں میں مکروہ سمجھتا ہوں)کے بجائے’إنکم تأکلون طعاما خبیثا هاتین الشجرتین‘(تم ایک مکروہ کھانا ان دو پودوں کی صورت میں کھاتے ہو)کے الفاظ روایت ہوئے ہیں،جبکہ حمیدی،رقم ۱۰ میں’إنی أحسب أنکم تأکلون شجرتین‘(میرا خیال ہے تم یہ دو پودے کھاتے ہو)کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔بعض روایات مثلاً ابن خزیمہ،رقم ۱۶۶۶ میں’لا أراهما إلا خبیثتین‘(میں انھیں مکروہ سمجھتا ہوں)کے بجائے’ما أراهما إلا خبیثتین‘(میں انھیں مکروہ سمجھتا ہوں)کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن خزیمہ،رقم ۱۶۶۶ میں’هذا البصل والثوم‘(یہ پیاز اور لہسن)کی جگہ’هذا البصل وهذا الثوم‘(یہ پیاز اور یہ لہسن)کے الفاظ روایت ہوئے ہیں،جبکہ سنن الکبریٰ،رقم ۶۶۸۲ میں’الثوم والبصل‘(لہسن اور پیاز)کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن خزیمہ،رقم ۱۶۶۶ میں’لقد رأیت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم إذا وجد ریحهما من الرجل فی المسجد أمر به فأخرج إلی البقیع‘(میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ کو مسجد میں کسی آدمی سے ان کی بو آتی تو آپ اسے بقیع کی طرف نکل جانے کا حکم دیتے)کی جگہ’وقد کنت أری الرجل یوجد ریحه فیؤخذ بیده فیخرج به إلی البقیع‘(میں دیکھا کرتا تھا کہ جس آدمی سے اس کی بو آتی،اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بقیع کی طرف نکال دیا جاتا)کے الفاظ روایت ہوئے ہیں،جبکہ سنن الکبریٰ،رقم ۶۶۸۲ میں’إن کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لیأمر بالرجل یوجد منه ریحهما فیخرج إلی البقیع‘(بے شک،نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے آدمی کو جس سے اس کی بو آتی حکم دیتے تو وہ بقیع کی طرف نکل جاتا)کے الفاظ،ابن ماجہ،رقم ۱۰۱۴ میں’ولقد کنت أری الرجل علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یوجد ریحه منه فیؤخذ بیده حتی یخرج إلی البقیع‘(بے شک،میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں دیکھا کرتا تھا کہ جس آدمی سے اس کی بو آتی،اسے ہاتھ سے پکڑا جاتا یہاں تک کہ اسے بقیع کی طرف نکال دیا جاتا)کے الفاظ،ابن ماجہ،رقم ۳۳۶۳ میں’حتی یخرج إلی البقیع‘(یہاں تک کہ اسے بقیع کی طرف نکال دیا جاتا)کے بجائے’حتی یخرج به إلی البقیع‘(یہاں تک کہ اسے بقیع کی طرف نکال دیا جاتا)کے الفاظ،بیہقی،رقم ۱۶۳۵۵ میں’قد کنت أری الرجل علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یوجد ریحهما منه فیؤخذ بیده فیخرج إلی البقیع‘(میں دیکھا کرتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جس آدمی سے ان کی بو آتی،اسے ہاتھ سے پکڑ کر بقیع کی طرف نکال دیا جاتا)کے الفاظ،ابن ابی شیبہ،رقم ۲۴۴۸ میں’کنت أری الرجل علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یوجد ریحه منه فیؤخذ بیده حتی یخرج إلی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

البقيع'(میں دیکھا کرتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جس آدمی سے اس کی بو آتی، اسے ہاتھ سے پکڑ کر بقیع کی طرف نکال دیا جاتا) کے الفاظ، احمد بن حنبل، رقم ۸۹ میں'وأیم اللّٰه لقد کنت آری نبی اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یجد ریحهما من الرجل فیأمر به فیؤخذ بیده فیخرج به من المسجد حتی یؤتی به البقیع'(اللہ کی قسم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کرتا تھا کہ آپ کسی سے ان کی بو محسوس کرتے تو اسے حکم دیتے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مسجد سے نکال کر بقیع چھوڑ آتے) کے الفاظ، ابن حبان، رقم ۲۰۹۱ میں'وإن کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یأمر بالرجل یوجد منه ریحها فیخرج إلی البقیع'(نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس آدمی سے اس کی بو محسوس کرتے اسے بقیع کی طرف نکل جانے کا حکم دیتے) کے الفاظ، ابویعلیٰ، رقم ۱۸۴ میں'لقد رأیت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم إذا وجد من الرجل ریحهما فی المسجد أمر به فأخرج إلی البقیع'(میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ مسجد میں کسی آدمی سے ان کی بو محسوس کرتے تو آپ اسے بقیع کی طرف نکل جانے کا حکم دیتے) کے الفاظ، ابویعلیٰ، رقم ۲۵۶ میں'وإن کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یمر بالرجل یوجد منه ریحهما یخرج إلی البقیع'(اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسے آدمی کے پاس سے گزرتے جس سے ان پودوں کی بو آ رہی ہوتی تو آپ اسے بقیع کی طرف نکال دیتے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن خزیمہ، رقم ۱۶۶۶ میں'إن کنتم لا بد من آکلیهما فأمیتوهما طبخا'(اگر تمھیں ان سبزیوں کو کھانا ہی ہے تو پکا کر ان کی بو ختم کر لیا کرو) کے بجائے'ومن کان آکلهما فلیمتهما طبخا'(جس کسی کو یہ سبزیاں کھانی ہوں تو اسے چاہیے کہ انھیں پکا کر ان کی بو ختم کر لے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں، جبکہ سنن الکبریٰ، رقم ۶۶۸۲ میں'فمن کان منکم آکلهما لا بد فلیمتهما طبخا'(تو تم میں سے جس کسی نے یہ کھانی ہوں، وہ لازماً انھیں پکا کر ان کی بو ختم کر لے) کے الفاظ، سنن الکبریٰ، رقم ۶۶۸۴ میں'فإن کنتم آکلیهما فاقتلوهما بالنضج'(تو اگر تمھیں یہ کھانی ہی ہیں تو انھیں پکا کر ان کی بو ختم کر لو) کے الفاظ، ابن ماجہ، رقم ۱۰۱۴ میں'فمن کان آکلها لا بد فلیمتها طبخا'(تو جسے یہ لازماً کھانی ہو تو وہ اسے پکا کر اس کی بو ختم کر لے) کے الفاظ، ابن ماجہ، رقم ۳۳۶۳ میں'فمن کان آکلهما فلیمتهما طبخا'(تو جسے یہ کھانی ہوں تو اسے چاہیے کہ انھیں پکا کر ان کی بو ختم کر لے) کے الفاظ، ابن ابی شیبہ، رقم ۸۶۵۸ میں'فمن کان آکلهما لا بد له فلیمتهما طبخا'(تو جسے یہ کھانی ہی ہوں تو اس کے لیے لازم ہے کہ انھیں پکا کر ان کی بو ختم کر لے) کے الفاظ، ابن حبان، رقم ۲۰۹۱ میں'فمن کان لا بد آکلهما فلیمتهما طبخا'(تو جسے یہ لازماً کھانی ہوں تو اسے چاہیے کہ انھیں پکا کر

ان کی بوختم کرلے) کے الفاظ،حمیدی، رقم ۱۰ میں 'فإن كنتم لا بد فاعلين فاقتلوهما بالنضج ثم کلوهما' (تو اگر تمھیں ایسا کرنا ہی ہے تو تم انھیں پکا کر ان کی بوختم کر لیا کرو اور پھر انھیں کھایا کرو) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ وترتیب: اظہار احمد

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

حرمت جان کی شرط

(مسلم، حدیث ۲۳)

عن أبی مالك عن أبیه قال: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم یقول: من قال لا إله إلا اللّٰه و کفر بما یعبد من دون اللّٰه حرم ماله و دمه و حسابه علی اللّٰه.

''ابو مالک اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اللہ کے علاوہ جنھیں پوجا جاتا ہے، ان کا انکار کر دیا تو اس کا مال اور اس کا خون حرام ہو گیا۔ اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔''

اگلی روایت اسی روایت کا ایک دوسرا متن ہے جس کا آغاز 'من و حد اللّٰه' سے ہوا ہے اور اس کے بعد بعینہٖ یہی الفاظ ہیں۔

لغوی مباحث

من و حد اللّٰه: 'و حد' کا مطلب ہے ایک بنانا۔ لیکن اس جملے میں اس سے مراد ایک اللہ پر ایمان لانا اور باقی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معبودوں سے انکار کر دینا ہے۔

معنی

اس روایت کو دو پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک پہلو تو وہی ہے جس سے اسے امام مسلم نے دیکھا ہے۔ انھوں نے اسے جس روایت کے ساتھ اور جس باب میں درج کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایت اسی مضمون کی حامل ہے جو اس سے پچھلی روایت میں بیان ہوا ہے۔ پچھلی روایت جیسا کہ ہم اس کی شرح میں لکھ چکے ہیں سرتاسر مشرکین عرب کے ساتھ قتال سے متعلق ہے۔ اس روایت کے الفاظ میں اس بات کی گنجایش ہے کہ اسے بھی اسی معنی میں لیا جائے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسے مسلمانوں کے باہمی تعلق کے حوالے سے دیکھا جائے۔ اس پہلو سے یہ بالکل وہی بات بن جاتی ہے جو 'المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ' میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی اس روایت میں مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ جب کوئی آدمی کلمۂ توحید کا اقرار کر لے اور باقی معبودوں کی پرستش چھوڑ دے تو اس کے مال اور جان کے خلاف تعدی جائز نہیں ہے۔ تمھارا یہ سوچنا ٹھیک نہیں ہے کہ یہ ایمان حقیقی نہیں ہے۔ ایمان کی حقیقت کا فیصلہ اللہ علیم بذات الصدور پر ہے۔ اس کا حساب وہی کرے گا۔ ہمارے خیال میں اس روایت کو سمجھنے میں یہ دوسرا پہلو ہی مرجح ہے۔ ہم نے ابوداؤد اور ترمذی سے جو متون اگلی فصل میں نقل کیے ہیں، وہ ہماری بات کو موکد کرتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

متون

اس روایت کے متون دو ہی ہیں۔ یہ دونوں متن امام مسلم نے اپنی صحیح میں درج کر دیے ہیں۔ ایک متن میں 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کے الفاظ میں توحید کا بیان ہے اور دوسرے میں اسی کے لیے 'وحد اللّٰہ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ صرف ایک فرق ایسا ہے جو مسلم رحمہ اللہ نے نقل نہیں کیا اور وہ یہ کہ 'حرم مالہ ودمہ' کے بجائے ایک روایت میں 'حرم اللّٰہ مالہ ودمہ' کے الفاظ ہیں۔ البتہ، اگر اس روایت کو، جیسا کہ ہم نے معنی کی بحث میں بیان کیا ہے، دوسرے معنی میں لیا جائے تو اس سے ملتی جلتی کچھ اور روایتیں بھی کتب حدیث میں ملتی ہیں:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ قال نظر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الی الکعبۃ فقال: لا الٰہ الا اللّٰہ ما أطیبک	''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی طرف دیکھا تو کہا: لا الٰہ الا اللہ، تو کتنا اچھا ہے۔ تیری خوش بو کتنی اچھی ہے۔ تیری

وأطيب ريحك وأعظم حرمتك والمؤمن أعظم حرمة منك إن الله عزوجل جعلك حرا ما وحرم من المؤمن ماله ودمه وعرضه وأن نظن به ظنا سيئا.
(المعجم الکبیر، رقم ۱۰۹۶۶)

حرمت کتنی بڑی ہے۔ لیکن حرمت میں تجھ سے بڑھ کر ہے۔ اللہ نے تجھے حرم قرار دیا۔ اور اس نے مومن کے مال اور اس کے خون اور اس کی عزت کو اور یہ کہ اس کے بارے میں سوے ظن کیا جائے حرام قرار دیا۔‘‘

اس سے ملتی جلتی ایک روایت ابوداؤد میں بھی ہے:

عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم : كل المسلم على المسلم حرام ماله وعرضه ودمه حسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم. (ابوداؤد، رقم ۴۸۸۲)

’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر مسلمان دوسرے مسلمان پر حرام ہے، یعنی اس کا مال، اس کی عزت اور اس کا خون۔ ہر مسلمان کو اس شر سے بچنا چاہیے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔‘‘

ترمذی میں یہی روایت کچھ اور اجزا کے ساتھ ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتابیات

مسلم، رقم ۲۳۔ احمد، رقم ۱۵۹۱۵، ۱۵۹۱۹، ۲۷۲۵۵، ۲۷۲۵۶۔ السنن الکبریٰ، رقم ۹۹۴۹۔ المعجم الکبیر، رقم ۸۱۹۰، ۱۰۹۶۶۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۹۳۵، ۳۳۰۹۸۔ ابن حبان، رقم ۱۷۱۔ ابوداؤد، رقم ۴۸۸۲۔ ترمذی، رقم ۱۹۲۷۔

ساجد حمید

نماز کے اوقات

ظہر میں تاخیر

[۱۲] وحدثنی عن مالك عن ربیعة بن ابی عبد الرحمن عن القاسم بن محمد انه قال :

مَا اَدْرَکْتُ النَّاسَ اِلَّا وَهُمْ يُصَلُّوْنَ الظُّهْرَ بِعَشِيٍّ.

قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ

''میں نے لوگوں کو ہمیشہ ظہر دیر سے پڑھتے پایا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شرح

مفہوم ومدعا

ظہر کی نماز کے بارے میں اس روایت کا ظاہری مفہوم یہ معلوم ہو رہا ہے کہ صحابہ کے زمانے میں ظہر عموماً دیر سے پڑھی جاتی تھی۔ لیکن اس باب کی دوسری روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کو گرمیوں میں ابراد (ٹھنڈا) کر کے (عصر کے قریب) اور سردیوں میں اس سے پہلے پڑھتے تھے۔

امامت جبریل والی روایت میں ظہر کا آخری پسندیدہ وقت ایک مثل سایہ بتایا گیا ہے۔ قاسم بن محمد کی غالباً مراد

یہی ہے کہ ظہر عموماً ایک مثل سایے پر پڑھی جاتی تھی۔ یعنی عصر کے وقت کے قریب آنے پر۔ اسی لیے انھوں نے 'عشی' کا لفظ بولا ہے۔

روایت میں عموم بیان ہوا ہے۔ اس کے معنی گرم موسم کا عموم بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی کہ صحابہ نے ایک درمیانہ سا وقت ظہر کے لیے مقرر کر رکھا تھا، جس میں وہ ہر موسم میں نماز ادا کرتے رہتے تھے۔

لغوی مسائل

العشی: اس کے بارے میں اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ زوال سے غروب آفتاب یا زوال سے صبح تک کے وقت کو 'عشی' کہتے ہیں۔ 'عشی' دراصل سہ پہر اور اس کے بعد غروب آفتاب تک کا وقت ہے۔ یعنی جب سورج کی تمازت کم ہونے لگتی ہے، اس وقت سے اس کے ڈوبنے تک کا وقت 'عشی' ہے۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ یہ عموماً 'ابکار'، 'الغداة' یا 'بکرة' کا مقابل بن کر آتا ہے۔ جس طرح 'ابکار' اور 'بکرة' میں دوپہر شامل نہیں ہے، اسی طرح 'عشی' میں دوپہر اور اس کی شدت کا وقت شامل نہیں ہے۔ سورۂ روم میں اس کا تقابل 'تظهرون' سے ہوا ہے:

فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ. وَلَهُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَعَشِیًّا وَّحِیۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ. (۳۰: ۱۷۔۱۸)

''پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے اور جس وقت صبح کرتے ہو اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہو رہی ہے اور عشا کے وقت بھی اور اس وقت بھی جب تم ظہر کرتے ہو۔''

صاف واضح ہے کہ اس آیت میں صبح و شام کو جوڑا بنایا گیا ہے اور ظہر و عصر کو۔ یہی علامہ طبری اور کئی مفسرین کی رائے ہے۔ اور اسی کو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا ہے:

حین تمسون قال: صلاة المغرب، وحین تصبحون قال: صلاة الصبح، وعشیا قال: صلاة العصر، وحین تظهرون قال: صلاة الظهر. (تفسیر طبری ۲۱/ ۲۹)

'''حین تمسون' کے بارے میں انھوں نے کہا: یہ مغرب کی نماز ہے اور 'حین تصبحون' کے بارے میں کہا کہ یہ فجر ہے اور 'عشی' کے بارے میں کہا کہ یہ عصر ہے اور 'حین تظهرون' کے بارے میں کہا کہ یہ ظہر ہے۔''

اگر دونوں آیتوں کو دیکھیں تو ان میں ایک طرح کی لف و نشر ہے۔ 'حین تمسون وحین تصبحون' اور دوسری آیت میں 'وعشیا وحین تظهرون' ہے۔ پہلے جملے میں شام کا ذکر صبح سے پہلے ہے، جو ہمارے شب و روز

میں صبح سے پہلے آتی ہے۔اسی طرح دوسرے جملے میں دیکھیں تو وہاں بھی ترتیب یہی ہے کہ عصر ظہر کے بعد آتی ہے، مگر اسے شام کی طرح ظہر سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب بھی دلالت کرتی ہے کہ یہاں 'عشـی' سے مراد سہ پہر یا اس سے تھوڑا پہلے سے لے کر مغرب تک کا وقت ہے۔

ہمارے خیال میں اس حدیث میں بھی یہ اسی معنی میں ہے۔یعنی اس سے اصل میں مراد دن کا آخری حصہ ہے۔ مطلب وہی ہے، جسے ہم نے اوپر ترجمے میں بیان کر دیا ہے کہ وہ تاخیر سے ظہر پڑھتے۔لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ سہ پہر کے وقت ظہر پڑھتے تھے، بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کا وقت سہ پہر کے قریب کا وقت تھا۔

دوسرا لغوی مسئلہ اس میں اس جملے کا عموم ہے کہ ''میں نے لوگوں کو ہمیشہ ظہر 'عشـی' میں پڑھتے پایا''۔اس عموم سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کی ظہر ہمیشہ تاخیر سے ہوتی تھی۔روایتوں میں سیاق وسباق اور موقع ومحل چونکہ نقل نہیں ہوتا، اس لیے اسے دوسری روایتوں کی روشنی میں رکھ کر ہی دیکھنا چاہیے۔ جسے ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔لغوی اعتبار سے بھی یہ الفاظ لازم نہیں ہیں کہ مستقل عمل بیان کریں۔مثلاً اگر بحث گرمیوں ہی کے وقت کے بارے میں ہو رہی تھی تو یہ جملہ گرمیوں کے ذکر کے بغیر بھی گرمی کے موسم میں ہونے والی نمازوں تک محدود ہوگا۔اور وہ معنی بھی ہو سکتے ہیں جو ہم نے اوپر بیان کیے کہ ایک وسطی سا وقت تھا جس کو صحابہ نے مقرر کر لیا تھا اور گرمیوں اور سردیوں میں اسی وقت میں نماز ادا کرتے رہتے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

درایت

قرآن وسنت سے تعلق

سنت میں ظہر کے لیے ظہر ہی کا وقت جاری کیا گیا ہے۔قرآن سے بھی اس وقت کے وقت نماز ہونے پر نص موجود ہے (الروم ۳۰: ۱۸)۔جیسا کہ ہم نے پچھلی روایتوں کے تحت بیان کیا ہے کہ نمازیوں کی سہولت کے لیے سنت نے جو وقت مقرر کیے، وہ بھی تنگ نہیں تھے۔ پھر ان اوقات میں جو پسندیدہ اوقات انبیا نے چنے، وہ بھی مناسب وسعت رکھتے تھے۔یعنی ایسا نہیں ہے کہ کہا گیا ہو کہ عصر کا پسندیدہ وقت بس اتنا ہی وقت ہے جب سایہ ایک مثل ہو۔ بلکہ یہ وقت بھی لمبا ہے، جس کے آغاز اور اختتام میں اچھا خاصا وقت ہوتا ہے۔ایسا اس لیے ہے کہ اچھے برے موسم، سرد وگرم حالات میں آدمی اس خیر سے محروم نہ رہے۔

چنانچہ اس کھلے وقت کا یہ فائدہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گرمیوں میں اور سردیوں میں اور اسی طرح نمازیوں کی

سہولت کے لیے پسندیدہ وقت ہی میں نماز کی تعجیل و تاخیر کر کے نمازیوں کے لیے سہولت کا وقت نکال لیتے تھے۔ صحابہ نے بھی اسی طریقے کو اختیار کیا۔ چنانچہ اس روایت میں صحابہ کے جس عمل کا ذکر ہے، وہ سنت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ اسی طریقے کے مطابق ہے، جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا۔ چنانچہ سب شارحین نے یہی رائے اختیار کی ہے کہ اس سے مراد ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھنا ہے۔

یہ بات بھی قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوگی کہ انھوں نے ایسا درمیانہ سا وقت ظہر کے لیے مقرر کر لیا جو پسندیدہ وقت ہی سے ہو، مگر گرمیوں اور سردیوں، دونوں میں یکساں چل سکتا ہو۔

احادیث باب پر نظر

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر گرمی کے موسم میں ابراد کر کے (تاخیر سے) ادا کرتے تھے:

عن ابی ذر قال: اذن مؤذن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم الظهر، فقال ابُرِد ابرد او قال انتظر انتظر، وقال شدة الحر من فیح جهنم فاذا اشتد الحر فابردوا عن الصلاة حتی راینا فیء التلول . (بخاری، رقم ۵۱۱)

''ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن نے ظہر کی اذان دی تو آپ نے فرمایا: ابھی ٹھنڈا کرو، ابھی اسے ٹھنڈا کرو۔ یا آپ نے یہ فرمایا تھا کہ ٹھہرو، بھئی ٹھہرو۔ اور مزید یہ فرمایا: گرمی کی شدت جہنم کا جوش ہے، اس لیے جب بہت گرمی ہو تو نماز کو اس وقت پڑھو، جب سورج کی تمازت کم ہو جائے۔ تو نماز میں اتنی دیر کی گئی، کہ ہم نے ٹیلوں کے سائے دیکھے (تو نماز پڑھی)۔''

اس روایت سے تاخیر میں 'عشی' کے وقت تک تاخیر کرنے کا واضح ثبوت موجود ہے۔ یعنی موطا کی روایت جس کی اس وقت ہم شرح کر رہے ہیں، اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ صحابہ ظہر 'عشی' کے وقت پڑھتے تھے۔

'تلول' چھوٹے ٹیلوں کو کہتے ہیں، ان کے سائے دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ سورج کافی نیچے آ گیا تھا۔ یقیناً یہ وقت عصر کے وقت سے پہلے ہی تھا۔ غالباً ایک مثل سایے پر اس لیے کہ دوسری روایتوں سے اسی کی خبر ملتی ہے۔

سردیوں میں آپ کا معمول یہ تھا کہ آپ نماز کو ذرا جلدی ادا کرتے تھے۔ حضرت انس کی روایت ہے:

عن انس بن مالك قال: كان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم اذا كان الحر

''انس بن مالک کی روایت ہے کہ انھوں نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گرمی میں نماز تاخیر سے پڑھتے (ابراد

ابرد بالصلاۃ و اذا کان البرد عجل.

کرتے) اور سردی میں تعجیل کرتے۔''

(نسائی، رقم ۴۹۹)

اس روایت میں ظہر کے الفاظ نہیں ہیں، یعنی یہ اصول ممکن ہے عصر وظہر، دونوں کے بارے میں رہا ہو کہ سردیوں میں آپ دونوں نمازیں دھوپ کے ہوتے ہوئے ادا کر لیتے تھے۔ گرمیوں میں دونوں میں تاخیر کرتے تھے۔ اس لیے کہ سورج کی موجودگی میں بس یہی دونوں نمازیں پڑھی جاتی ہیں:

عن خباب قال: شکونا الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الصلاۃ فی الرمضاء فلم یشکنا. (مسلم، رقم ۶۱۹)

''خباب کی روایت ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ ریت گرم ہوتی ہے (چلتے ہوئے پاؤں جلتے ہیں) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری شکایت کا جواب نہیں دیا۔''

یہ روایت ظہر کو ٹھنڈا کرنے کے حکم سے پہلے کی ہے یا بعد کی، اس تعین کے لیے اس روایت کے الفاظ حتمی نہیں ہیں۔ البتہ، یہ الفاظ کہ ہم نے شکایت کی تو آپ نے جواب نہیں دیا، یہ بتا رہے ہیں کہ اس میں زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ یہ ابراد کے حکم کے بعد کی ہو۔ یعنی آپ نے نماز کے وقت میں مزید تاخیر کی گنجایش نہیں پائی تو خاموش رہے۔ جتنی تاخیر آپ کر سکتے تھے، وہ آپ پہلے ہی کر رہے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

موطا کی زیر شرح روایت میں یہ بات کہ ان کی نماز عموماً تاخیر سے ہی ہوتی تھی اس کے معنی یہ لیے جا سکتے ہیں کہ ظہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تاخیر ہی سے ادا ہو رہی تھی۔ اور اسی پر صحابہ کا عمل رہا۔ سردیوں میں عجلت اور گرمی میں تاخیر والی روایت اس بات کے خلاف نہیں جاتی، اس لیے کہ وہ صرف یہ کہہ رہی ہے کہ نماز کا وقت سردیوں میں گرمیوں کے مقابلے میں پہلے ہو جاتا تھا۔ اس کے معنی یہ لازم نہیں ہیں کہ وہ بالکل شروع میں چلا جاتا تھا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان تو سورج کے زوال ہی پر دے دی جاتی تھی، لیکن نماز میں پھر بھی تاخیر ہوتی تھی:

عن جابر بن سمرۃ قال: کان بلال یؤذن اذا دحضت فلا یقیم حتی یخرج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاذا خرج اقام الصلاۃ حین یراہ.

(مسلم، رقم ۶۰۶)

''جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ حضرت بلال سورج کے ڈھلتے ہی اذان کہہ دیتے تھے۔ لیکن اقامت اس وقت تک نہ کہتے جب تک آپ اپنے حجرے سے نہ نکلتے، چنانچہ جب آپ نکل آتے تو پھر وہ آپ کو دیکھ کر اقامت کہتے تھے۔''

اس لیے بعید نہیں ہے کہ ظہر کا وقت بالعموم وہی ہو جو قاسم بن محمد نے موطا کی زیر بحث روایت میں بیان کیا ہے۔

یعنی 'عشی' کے آغاز میں۔ یہ بات ان روایتوں کے بھی خلاف نہیں جو حدیثوں میں آئی ہے کہ آپ ظہر دوپہر کے وقت پڑھتے تھے:

عن جابر بن عبد الله فقال: كان النبی صلی اللّٰه علیه و سلم یصلی الظهر بالهاجرة. (بخاری، رقم ۵۳۵)	''جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر دوپہر میں پڑھتے تھے۔''

موطا کے اس زیر بحث اثر سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ صحابہ نے اس زمانے میں آ کر غالباً ایک ہی وقت مقرر کر لیا تھا۔ اور وہ 'عشی' کے وقت تک اس کی تاخیر کا وقت تھا۔ عین ممکن ہے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ظہر کے اختتامی وقت کے دو مثل سایہ ہونے کا جو حکم لگایا تھا، وہ صحابہ کے اس عمل کی روشنی میں ہو۔

لیکن اس امکان کے باوجود کہ ظہر 'عشی' تک موخر کی جاتی تھی، روایتوں کی حد تک واضح تر بات یہی ہے کہ گرمیوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کو سایوں میں کچھ طوالت تک موخر کرتے، تاکہ سورج کی حدت میں کمی آئے اور یہ کہ لوگ دیواروں کے زیر سایہ مسجد تک آسکیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روایت

یہ روایت ایک اثر ہے۔ اس سے صرف یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ان کے زمانے میں ظہر باقاعدگی سے موخر کر کے پڑھی جا رہی تھی۔ قاسم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد کے صاحب زادے ہیں۔ ان کا شمار فقہاے تابعین میں ہوتا ہے۔ اور کبار تابعین میں سے ہیں۔ ان کی وفات کم وبیش ۱۰۶ ہجری میں ہوئی ہے۔

اس اعتبار سے یہ دور صحابہ کے عینی شاہد ہیں۔ اس لیے ان کی بات کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے اس باب کے اختتام پر ان کا یہ قول نقل کر دیا ہے کہ ظہر کے باب میں صحابہ کا عمل کیا رہا ہے۔ اور یقیناً امام مالک نے اہل مدینہ کو اس کے خلاف نہ پایا ہوگا، ورنہ وہ اسے اپنی کتاب میں یوں نقل نہ کرتے۔

اس باب پر ایک نظر

اس روایت پر 'وقوت الصلوٰۃ' کا باب ختم ہوا۔ ہم نے اس باب میں درج ذیل باتیں جانی ہیں:

۱۔تمام نمازوں کے اوقات سنت ثابتہ متواترہ میں مقرر کیے گئے ہیں۔سنت میں ان نمازوں کے نام مقرر کر کے دراصل ان کے وقت مقرر کیے گئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں کے ناموں کے بارے میں بہت حساس تھے۔آپ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے سوا نمازوں کے کوئی اور نام رکھیں جائیں:

عن عبد اللّٰہ المزنی ان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال :لا تغلبنکم الاعراب علی اسم صلاتکم المغرب . قال و تقول الاعراب ھی العشاء .

(بخاری،رقم ۵۳۸)

''عبداللہ المزنی کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، بدووں (کی زبان) مغرب کے نام کے معاملے میں تم پر غالب نہ آنے پائے۔عبداللہ کہتے ہیں کہ بدو مغرب کو عشا کہتے تھے۔''

اسی طرح عشا کو 'العتمۃ' کہنے کے بارے میں فرمایا:

عن عبد اللّٰہ بن عمر قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم یقول: لا تغلبنکم الاعراب علی اسم صلاتکم الا انہا العشاء وھم یعتمون بالابل. (مسلم،رقم ۶۴۴)

''عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ تم پر تمھاری نماز کے نام کے معاملے میں بدو ہرگز غالب نہ آنے پائیں۔یاد رکھو کہ عشا کا نام عشا ہے اور وہ چونکہ اونٹوں کا دودھ عتمہ کے وقت (ایک تہائی رات کے آس پاس) دوہتے ہیں، (تو اس لیے وہ عشا کو عتمہ کہتے ہیں۔)''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۔موطا کے اس باب میں اس سنت کے لحاظ سے تین طرح کی روایتیں آئی ہیں۔

الف۔وہ روایتیں جو سنت ہی کو بیان کر رہی ہیں۔جیسے تیسری روایت۔

ب۔وہ روایتیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول یا آپ کے پسندیدہ اوقات کو بیان کیا گیا ہے۔جیسے پہلی، دوسری اور چوتھی روایت۔

ج۔وہ روایتیں جن میں اس سنت پر عمل کرنے میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کا حل دیا گیا ہے، جیسے پانچویں روایت۔

۳۔اس کے بعد آثار صحابہ ہیں۔ان میں بھی روایتیں اکثر پسندیدہ وقت ہی کے پہلو سے ہیں۔

اس اعتبار سے روایتوں کا باہمی اختلاف حل ہو جاتا ہے۔نمازوں کے اوقات دو نوعیت کے ہیں۔ایک وہ مقررہ اوقات ہیں جن میں نماز پڑھنے والے کی نماز قضا شمار نہیں ہوگی۔جبکہ دوسرے وہ اوقات ہیں جن میں نماز ادا

کرنے والا ان اوقات میں نماز پڑھے گا جن میں نماز پڑھنے والے پر سستی، کاہلی اور نماز سے بے پروائی کا الزام نہیں آئے گا۔

یہ پسندیدہ اوقات اصلاً تعجیل کے اصول پر مقرر کیے گئے ہیں۔ مگر اس اصول میں دو وجوہ سے تبدیلی کی گئی ہے۔ ظہر اور فجر میں اس تعجیل کو ترک کیا گیا ہے تاکہ نمازیوں کو آنے میں سہولت رہے۔ عشا کی نماز میں اس وجہ سے تاخیر کی گئی ہے کہ ایسا کرنا نماز سے بے پروائی کا تاثر پیدا کرتا ہے کہ آدمی فٹا فٹ نماز پڑھ آئے اور آکر گپ شپ کرتا رہے۔ اس تاثر سے بچنے کے لیے آپ نے فرمایا کہ عشا کو موخر کرو اور اس کے بعد باتیں وغیرہ کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے جس طرح سے اس باب کو ترتیب دیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ کون سا عمل ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دور صحابہ کا معمول بہ کہا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انھوں نے وہ روایات دی ہیں جن میں اس معمول کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس کے بعد انھوں نے صحابہ کے اقوال اور ان کے معمول سے یہ بات ثابت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی مدینہ میں یہ عمل اسی طرح سے چلتا رہا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

اخلاقیات

(۶)

گزشتہ سے پیوستہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

والدین کے علاوہ جو تعلقات اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، ان میں بھی آدمی کا رویہ درجہ بدرجہ یہی ہونا چاہیے۔ قرآن نے ایک دوسری جگہ یہ بات پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا، وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا، وَّبِذِي الْقُرْبٰى، وَالْيَتٰمٰى، وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى، وَالْجَارِ الْجُنُبِ، وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ، وَابْنِ السَّبِيْلِ، وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا. (النساء ۴: ۳۶)

’’اللہ کی بندگی کرو اور کسی چیز کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور رشتہ داروں، یتیموں، فقیروں، قرابت مند پڑوسی، اجنبی پڑوسی، ہم پہلو، مسافر اور اپنے غلاموں کے ساتھ بھی۔ اس لیے کہ اللہ اترانے والوں اور بڑائی مارنے کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

اعزہ واقربا

آیت سے واضح ہے کہ والدین کے بعد ان تعلقات میں پہلا حق اعزہ واقربا کا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے حسن سلوک کو صلۂ رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسانوں کے مابین وجہ تعلق ہم عمری بھی ہو سکتی ہے، ہم درسی، ہم سایگی،

ہم نشینی، ہم مذاقی، ہم پیشگی اور ہم وطنی بھی، لیکن ان تمام تعلقات میں سب سے بڑھ کر وہی تعلق ہے جو رحم مادر کے اشتراک سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جسے توڑنا انسان کے لیے کسی طرح زیبا نہیں ہے، لہٰذا اس کے حقوق کی نگہداشت بھی سب سے مقدم ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیۡكُمۡ رَقِیۡباً. (النساء۴:۱)

''اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ تم ایک دوسرے کو دیتے ہو اور رشتوں کے بارے میں بھی خبردار رہو۔ بے شک، اللہ تم پر نگران ہے۔''

اس کی یہی اہمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی واضح ہوتی ہے۔

ابوہریرہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: رحم رحمٰن ہی سے نکلا ہوا ہے، لہٰذا اللہ نے اسے مخاطب کر کے کہا ہے کہ جس نے تجھے ملایا، اس کو میں نے اپنے ساتھ ملایا اور جس نے تجھے کاٹا، اس کو میں نے بھی الگ کیا[۴۰]۔

انھی کا بیان ہے کہ ایک دوسرے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار کیا اور فرمایا: اللہ مخلوقات کو پیدا کر چکے تو رحم بارگاہ الٰہی میں کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا: یہ اُس کی جگہ ہے جو قطع رحمی سے آپ کی پناہ چاہتا ہے۔ اللہ نے فرمایا: بے شک، کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھے ملائے، اس کو میں اپنے ساتھ ملاؤں اور جو تجھے کاٹے، اس کو میں بھی اپنے سے الگ کر دوں[۴۱]۔

ابوایوب انصاری کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یارسول اللہ، مجھے کوئی ایسی بات بتایے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ ارشاد ہوا: اللہ کی بندگی کرو، کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ؛ نماز کا اہتمام کرو، زکوٰۃ دو اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو[۴۲]۔

جبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا: قطع رحمی کرنے والا کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا[۴۳]۔

انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے حضور کا یہ ارشاد سنا ہے کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اُس کی روزی میں وسعت اور عمر میں برکت ہو، اسے چاہیے کہ صلۂ رحمی کرے[۴۴]۔

۴۰؎ بخاری، رقم ۵۶۴۲۔

۴۱؎ بخاری، رقم ۵۶۴۱۔ مسلم، رقم ۲۵۵۴۔

۴۲؎ بخاری، رقم ۵۶۳۷۔

۴۳؎ بخاری، رقم ۵۶۳۸۔ مسلم، رقم ۲۵۵۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس کا کمال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ قطع رحمی کرنے والوں کے ساتھ بھی اسی کا اہتمام رکھا جائے۔[45]

یتامیٰ اور مساکین

اعزہ واقربا کے بعد یتامیٰ ومساکین کو اس حکم میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ گویا یہ بھی قرابت مندوں ہی کے زمرے میں ہیں، لہٰذا ہر مسلمان کو انھیں اسی نگاہ سے دیکھنا چاہیے اور اسی جذبے سے ان کی خدمت اور سرپرستی کرنی چاہیے۔ نیکی اور خیر کا جو نصب العین اس دنیا میں انسان کو دیا گیا ہے، قرآن نے ایک جگہ بتایا ہے کہ اس تک پہنچنے کے لیے پہلا قدم یہی ہے کہ غلام آزاد کیے جائیں اور یتامیٰ ومساکین کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ، وَمَآ اَدْرٰكَ مَاالْعَقَبَةُ؟ فَكُّ رَقَبَةٍ، اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ، يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ، اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ. (البلد ۹۰: ۱۱۔۱۶)

”پر وہ گھاٹی نہیں چڑھا۔ اور تم کیا سمجھے کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ (یہی کہ) گردن چھڑائی جائے اور بھوک کے دن کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔“

سورۂ فجر میں جو اسلوب اس کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب صرف یہ نہیں کہ یتامیٰ و مساکین کی کچھ مدد کی جائے، بلکہ اصلی مطلوب یہ ہے کہ انھیں معاشرے میں عزت کا مقام حاصل رہے:

كَلَّا، بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ، وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. (۸۹: ۱۷۔۱۸)

”ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم کی قدر نہیں کرتے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کے لیے ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا صلہ یہ بیان فرمایا ہے کہ میں اور یتیموں کی کفالت کرنے والے جنت میں ایک دوسرے کے اس طرح قریب ہوں گے، جس طرح دو انگلیاں قریب ہوتی ہیں۔[46]

پڑوسی، مسافر اور غلام

اس کے بعد پڑوسی، مسافر اور غلام کا ذکر ہے اور ان سے بھی اسی حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ تمدن کی تبدیلی کے باوجود مسافر تو اب بھی کسی نہ کسی صورت میں ضرورت مند ہو جاتے ہیں، لیکن غلامی اس زمانے میں ختم ہو چکی ہے۔ اسلام نے جو اقدامات اسے ختم کرنے کے لیے کیے، ان کی تفصیلات ہم نے اسی کتاب میں ”قانون معاشرت“ کے

---

۴۴ بخاری، رقم ۵۶۳۹۔ مسلم، رقم ۲۵۵۷۔

۴۵ بخاری، رقم ۵۶۴۵۔

۴۶ بخاری، رقم ۵۶۵۹۔ مسلم، رقم ۲۹۸۳۔

زیرعنوان بیان کر دی ہیں۔ پڑوسی کے بارے میں، البتہ قرآن کا تصور مذہب و اخلاق کی تاریخ میں ایک بالکل ہی منفرد تصور ہے۔ عام طور پر تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ پڑوسی وہ ہے جس کا مکان آپ کے مکان سے ملا ہوا یا اس کے قریب ہے، لیکن قرآن نے بتایا ہے کہ پڑوسی تین قسم کا ہوتا ہے:

ایک وہ جو پڑوسی بھی ہے اور قرابت مند بھی۔ اسے 'الجار ذی القربیٰ' سے تعبیر کیا ہے اور اس کا ذکر سب سے پہلے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے پڑوسیوں کے مقابلے میں یہ حسن سلوک کا زیادہ حق دار ہے۔

دوسرا وہ جو قرابت مند تو نہیں ہے، لیکن پڑوسی ہے۔ اس کے لیے 'الجار الجنب' یعنی اجنبی پڑوسی کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اجنبیت رشتہ و قرابت کے لحاظ سے بھی ہو سکتی ہے اور دین و مذہب میں اختلاف کے باعث بھی ہو سکتی ہے۔ قرابت مند پڑوسی کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

تیسرا وہ جو سفر و حضر میں کسی جگہ آدمی کا ساتھی یا ہم نشین بن گیا ہے۔ قرآن نے اسے 'الصاحب بالجنب' سے تعبیر کیا ہے اور اس کے لیے بھی اسی طرح حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے جس طرح دوسرے پڑوسیوں کے لیے فرمائی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس باب میں یہ ہیں:

ابوشریح کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا کی قسم، وہ مومن نہ ہوگا؛ خدا کی قسم، وہ مومن نہ ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا: کون یا رسول اللہ؟ فرمایا: جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں ہے[۴۷]۔

انھی کا بیان ہے کہ ارشاد ہوا: جو اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے[۴۸]۔

سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا: جبریل نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اس قدر تاکید کی کہ مجھے خیال ہوا، یہ تو عنقریب اسے وراثت میں حق دار بنا دیں گے[۴۹]۔

ابوذر غفاری کا بیان ہے کہ آپ نے انھیں نصیحت فرمائی: ابوذر، شوربا پکاؤ تو اس میں پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو[۵۰]۔

۴۷؎ بخاری، رقم ۵۶۷۰۔

۴۸؎ بخاری، رقم ۵۶۷۳۔

۴۹؎ بخاری، رقم ۵۶۶۸۔ مسلم، رقم ۲۶۲۴۔

۵۰؎ مسلم، رقم ۲۶۲۵۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ یہی نصیحت آپ نے عورتوں کو بھی کی اور فرمایا: مسلمان بیویو، تم میں سے کوئی اپنی پڑوسن کے لیے کسی تحفے کو حقیر نہ سمجھے، اگرچہ وہ بکری کا ایک کھر ہی کیوں نہ ہو[۵۱]۔

(باقی)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۵۱؎ بخاری، رقم ۵۶۷۱۔

محمد مبشر نذیر

الحاد جدید کے مغربی اور مسلم دنیا پر اثرات

الحاد کا لفظ عموماً لادینیت اور خدا پر عدم یقین کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک توحید، نبوت و رسالت اور آخرت، تینوں عقائد ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا انکار یا اس سے اعراض باقی دو کو غیر موثر کر دیتا ہے، اس لیے ان میں کسی ایک کا انکار بھی الحاد ہی کہلائے گا۔ چنانچہ اس تحریر میں ہم جس الحاد کی تاریخ پر گفتگو کریں گے، وہ وجود خدا، نبوت و رسالت اور آخرت میں سے نظریاتی یا عملی طور پر کسی ایک یا تینوں کے انکار پر مبنی ہے۔ ہماری اس تحریر میں الحاد کی تعریف میں مروج 'Atheism'، 'Deisim' اور 'Agnosticism' سب ہی شامل ہیں۔ ڈی ازم سے مراد آخرت کا انکار ہے، جبکہ ایتھزم اور ایگناسٹسزم خدا کے انکار سے متعلق ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ازمنۂ قدیم سے ہی بعض لوگ الحاد کے کسی نہ کسی شکل میں قائل تھے، لیکن اس معاملے میں خدا کے وجود کا انکار بہت ہی کم کیا گیا ہے۔ بڑے مذاہب میں صرف بدھ مت ہی ایسا مذہب ہے جس میں کسی خدا کا تصور نہیں پایا جاتا۔ ہندو مذہب کے بعض فرقوں جیسے جین مت میں خدا کا تصور نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں صرف چند فلسفی ہی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے خدا کا انکار کیا۔ عوام الناس کی اکثریت ایک یا کئی خداؤں کے وجود کی بہر حال قائل رہی ہے۔ نبوت و رسالت کا اصولی حیثیت سے انکار کرنے والے بھی کم ہی رہے ہیں، ہاں ایسا ضرور ہوا کہ جب کوئی نبی یا رسول ان کے پاس خدا کا پیغام لے کر آیا تو اپنے مفادات یا ضد و ہٹ دھرمی کی وجہ سے انھوں نے اس نبی یا رسول کا انکار کیا ہو۔ آخرت کا انکار کرنے والے ہر دور میں کافی بڑی تعداد میں دنیا میں موجود رہے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کے دور کے مشرکین کے بارے میں بھی یہی پتا چلتا ہے کہ وہ خدا کے منکر تو نہ تھے، لیکن ان میں آخرت پر یقین نہ رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔

عالمی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص الحاد دنیا میں کبھی قوت نہ پکڑ سکا۔ دنیا بھر میں یا تو انبیاے کرام علیہم السلام کے ماننے والے غالب رہے یا پھر دین شرک کا غلبہ رہا۔ دین الحاد کو حقیقی فروغ موجودہ زمانے ہی میں حاصل ہوا ہے جب دنیا کی غالب اقوام نے اسے اپنے نظام حیات کے طور پر قبول کر لیا ہے اور اس کے اثرات پوری دنیا پر پڑ رہے ہیں۔ اس تحریر میں ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ وہ کیا عوامل تھے جن کی بنیاد پر الحاد کو اس قدر فروغ حاصل ہوا؟ دنیا بھر میں الحاد کی تحریک نے کیا کیا فتوحات حاصل کیں اور اسے قبول کرنے والے ممالک اور اقوام کی سیاست، معیشت اور معاشرت پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ تاریخ کے مختلف ادوار میں الحاد کی تحریک نے کیا کیا رنگ اختیار کیے اور دور جدید میں الحاد کی کون سی شکل دنیا میں غالب ہے؟ مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو چکے ہیں اور اس کے مستقبل کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یورپ میں الحاد کی تحریک

یورپ میں قرون وسطیٰ ہی میں عیسائی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں اور چرچ کا ادارہ پوری طرح مستحکم ہو چکا تھا۔ جب تیسری صدی عیسوی میں عوام الناس کی اکثریت نے عیسائیت قبول کر لی تو ان کے بادشاہ قسطنطین نے بھی عیسائیت قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد عیسائی علما اور ان کے قائد پوپ کو حکومتی معاملات میں غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل ہو گیا۔ حکومتی طاقت کو استعمال کر کے انھوں نے معاشرے میں پھیلے ہوئے دین شرک اور بت پرستی کا خاتمہ کر دیا اور اس کے ماننے والوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جن لوگوں نے عیسائیت قبول کرنے سے انکار کیا، انھیں تہ تیغ کر دیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ پھر عیسائیت میں بھی حلول اور مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے کا عقیدہ پیدا ہو گیا اور شخصیت پرستی اور اکابر پرستی نے جنم لیا جس نے ان کے دین میں شرک کو داخل کیا۔ عیسائی علما نے وقت کے مسلمہ نظریات، جن میں ارسطو اور افلاطون کے سائنسی اور فلسفیانہ افکار بھی شامل تھے، کی مقبولیت کے پیش نظر انھیں اپنے دین میں داخل کر لیا۔ حکومتیں پوپ اور مذہبی علما کی رہنمائی میں چلنے لگیں جسے آج تھیوکریسی کہا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مذہبی رہنما اپنے مسلک اور عقیدے میں شدت اختیار کرتے گئے۔ صدیوں کے انحطاط (degeneration) کے عمل سے ان میں بہت سے فرقے بھی پیدا ہو گئے اور ان میں اخلاقی انحطاط بھی در

آیا۔ مذہبی انتہا پسندی اس حد تک پہنچ گئی کہ کوئی بھی شخص جو مرکزی چرچ کے معمولی سے حکم سے بھی اختلاف کرتا، اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتا۔ نئے علوم وفنون کی تحصیل پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اسی دور میں مسلمانوں نے یونانی فلسفے کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں قابل قدر اضافے کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اہل یورپ میں بھی علم حاصل کرنے کا شعور پیدا ہوا اور وہ یہی چیزیں سیکھنے کے لیے مسلم دنیا میں آئے۔ ایک ممتاز امریکی مصنف کے الفاظ میں:

''جیسے جیسے مسلمانوں کا اقتدار پھیلتا گیا، یہ لوگ اچھے سیکھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے ثابت ہوئے۔ مسلمان حکمرانوں نے مفتوحہ علاقوں کی ترقی یافتہ تہذیب کے مقابلے میں اپنی کمزوری (limitation) کو محسوس کرتے ہوئے مقامی اداروں، خیالات، نظریات اور ثقافت کو اسلامی سانچے میں ڈھال لیا۔ انھوں نے اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ مفتوحین سے سیکھنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ عظیم لائبریریاں اور دارالتراجم قائم ہوئے۔ سائنس، طب اور فلسفہ کی بڑی بڑی کتابوں کو مشرق و مغرب سے اکٹھا کر کے ان کے ترجمے کیے گئے۔ یونانی، لاطینی، فارسی، شامی اور سنسکرت زبانوں سے ترجمہ کرنے کا کام عام طور پر یہودی اور عیسائی مفتوحین نے سرانجام دیا۔ اس طرح ادب، سائنس اور طب کی دنیا بھر کی بہترین کتابیں عوام الناس کے لیے میسر ہو گئیں۔ ترجمے کے دور کے بعد تخلیقی کام کا دور شروع ہوا۔ تعلیم یافتہ مسلمان مفکرین اور سائنس دانوں نے حاصل شدہ علم میں قابل قدر علمی اضافے کیے۔ یہ وہ دور تھا جس میں سائنس اور فلسفہ کے عظیم امام ابن سینا، ابن رشد اور الفارابی پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے شہروں قرطبہ، نیشاپور، قاہرہ، بغداد، دمشق اور بخارا میں بڑی بڑی لائبریریاں قائم ہوئیں، جبکہ یورپ اس دور میں دور تاریک سے گزر رہا تھا۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی سیاسی اور ثقافتی زندگیوں کو ان کے قبائلی اور مذہبی پس منظر کی رعایت سے اسلام کے فریم ورک میں لایا گیا۔ نئے نظریات اور طور طریقوں کو اسلامائز کیا گیا۔ اسلامی تہذیب ایک متحرک اور تبدیلی کے تخلیقی عمل کا نتیجہ تھی جس میں مسلمانوں نے دوسری تہذیبوں سے آزادانہ اچھی چیزوں کو لیا۔ یہ خود اعتمادی اور کھلے پن کا مظہر تھا جو اس خیال سے پیدا ہوا کہ ہم آقا ہیں غلام نہیں ہیں، فاتح ہیں مفتوح نہیں ہیں۔ بیسویں صدی کے مسلمانوں کے برعکس، وہ مسلمان تحفظ اور اعتماد کے احساسات سے بھرپور تھے۔ ان کو مغرب سے کچھ لینے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہوتی تھی، کیونکہ مغرب اس وقت ان پر سیاسی یا ثقافتی غلبہ نہ رکھتا تھا۔ کلچر کا یہ بہاؤ اس وقت الٹی سمت میں بہنے لگا، جب یورپ تاریک ادوار سے نکل کر مسلم مراکز میں اپنا کھویا ہوا ورثہ سیکھنے کے لیے آیا جس میں مسلمانوں کے ریاضی، طب اور سائنس کے اضافے بھی شامل تھے۔''

(The Islamic Threat: Myth or Reality، John L. Esposito، دوسرا ایڈیشن، ۳۳۔۳۴)

تیرھویں سے سترھویں صدی تک یورپ میں چرچ کے اقتدار اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اس دور میں یورپ میں رینی ساں (Renaissance) اور ریفارمیشن (Reformation) کی تحریکیں چلیں جن میں چرچ پر بھرپور تنقید کی گئی۔ اسی دوران میں مارٹن لوتھر کی مشہور پروٹسٹنٹ تحریک بھی چلی جس

نے دنیاے عیسائیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یورپ میں ایسے مفکرین بھی پیدا ہونے لگے جن کی تحقیقات نے ارسطو اور افلاطون کے ان سائنسی نظریات کو بھی چیلنج کر دیا جنھیں اہل کلیسا نے طویل عرصے سے مذہبی عقائد کا حصہ بنایا ہوا تھا۔ ان میں سب سے مشہور زمین کے کائنات کا مرکز ہونے اور اس کے ساکن ہونے اور سورج اور تمام اجرام فلکی کے زمین کے گرد گھومنے کا نظریہ تھا۔ ان مفکرین میں لیونارڈو ڈاونسی (۱۵۱۹ء۔۱۴۵۲ء)، جیارڈینو برونو (۱۶۰۰ء۔۱۵۴۸ء)، گلیلیو (۱۶۴۲ء۔۱۵۶۴ء) اور جوہانس کپلر (۱۶۳۰ء۔۱۵۷۱ء) زیادہ مشہور ہیں۔ مذہبی علما نے اس تنقید اور جدید نظریات کا سختی سے نوٹس لیا۔ انھوں نے عقل و منطق اور مشاہدے کی بنیاد پر حاصل ہونے والے سائنسی علم کو طاقت سے دبانا چاہا۔ احتساب (Inquisition) کی مشہور عدالتیں قائم ہوئیں جو اس قسم کے نظریات رکھنے والے مفکرین کو سخت سزائیں دیتیں۔ برونو کو کئی سال قید میں رکھنے کے بعد آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ گلیلیو کو اپنے عقائد سے توبہ کرنا پڑی ورنہ اسے بھی موت کی سزا سنا دی گئی تھی:

> ''رینی ساں کا دور فکر انسانی میں ہر اعتبار سے ترقی کا دور ہے۔ اس دور میں آزادانہ سوچ اور الحاد کو فروغ حاصل ہوا۔ صرف اور صرف چرچ کے حکم کی بنیاد پر کسی چیز کو قبول کرنے کی پابندی کے بڑے مخالفین میں لیونارڈو ڈاونسی تھے۔ انھوں نے علم کے حصول کے لیے تجربے کی اہمیت پر زور دیا۔ نکولو میکیاولی بھی چرچ پر مسلسل تنقید کرتے رہے۔ ان کی شہرت بھی ایک ملحد کی ہے۔... جیارڈینو برونو کی موت (۱۶۰۰ء) آزادی فکر کے نئے دور کا آغاز ہے۔ برونو اٹلی کے رہنے والے ایک مصنف تھے جو علم کلام کے ماہر تھے۔ اپنی تحریروں کے باعث انھیں محکمۂ احتساب (Inquisition) کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے پورے یورپ کا سفر کیا جس کے دوران میں وہ اپنے نظریات کو تقریر و تحریر کے ذریعے سے پھیلاتے رہے۔ انھیں گرفتار ہو جانے کا خطرہ بھی لاحق رہا۔ چودہ سال کے بعد، وینس شہر میں انھیں ان کے ایک پرانے شاگرد نے احتساب والوں کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا۔ برونو احتساب کی عدالت کے سامنے اپنے نظریات سے انحراف نہ کر سکے جن میں مسیح (علیہ السلام) کی الوہیت سے انکار، اس دنیا کے ہمیشہ باقی رہنے کا عقیدہ اور روح کے حلول کا عقیدہ شامل ہے۔ وہ نظام شمسی کے کوپرنیکی نظریے (یعنی سورج نظام شمسی کا مرکز ہے) پر بھی یقین رکھتے تھے اور اس پر لیکچر بھی دیا کرتے تھے۔ برونو پر مقدمہ چلایا گیا اور عدالت کے سامنے ان کا جرم ثابت ہو گیا۔ برونو نے روم میں سات سال جیل میں گزارے۔ بالآخر فروری ۱۶۰۰ میں انھیں آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ اگلے دو سو سال میں ان کے علاوہ آزادی فکر کے اور بھی شہید موجود ہیں۔'' (Dr. Gordon Stein، The History of Free Thought and Atheism۔ www.positiveatheism.org)

مذہبی علما اور سائنس دانوں میں یہ چپقلش چلتی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے پر اہل کلیسا کی گرفت کمزور ہوتی گئی اور فلسفیوں کا اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک ملحد فلسفیوں اور سائنس دانوں

کی فکر اہل یورپ میں غالب فکر بن چکی تھی۔ چونکہ اہل کلیسا نے اپنے اقتدار کے دور میں سائنس دانوں کے ساتھ بہت ظالمانہ اور جابرانہ رویہ رکھا تھا، اس لیے مذہب اور سائنس میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو چکی تھی۔ اہل سائنس نے مذہب کے بارے میں کوئی معقول رویہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے سائنسی نظریات کی روشنی میں یہی مناسب سمجھا کہ اسے خیر باد ہی کہہ دیا جائے۔ اس معاملے میں اہل مذہب کا کردار بھی اتنا معیاری نہ تھا کہ اس کی پیروی کی جاتی۔ چنانچہ مشہور برطانوی ملحد فلسفی برٹرینڈ رسل لکھتے ہیں:

''میں تو یہاں تک سوچا کرتا ہوں کہ بعض اہم نیکیاں مذہب کے علم برداروں میں نہیں ملتیں۔ وہ ان لوگوں میں پائی جاتی ہیں جو مذہب کے باغی ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو نیکیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور وہ راست بازی اور ذہنی دیانت ہیں۔ ذہنی دیانت سے میری مراد پیچیدہ مسائل کو ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر حل کرنے کی عادت ہے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جب تک کافی ثبوت اور شہادتیں دستیاب نہ ہوں، تب تک ان مسائل کو غیر حل شدہ ہی رہنے دیا جائے۔... تحقیق کی حوصلہ شکنی ان میں سب سے پہلی خرابی ہے۔ لیکن دوسری خرابیاں بھی پیچھے نہیں رہتیں۔ قدامت پسندوں کو قوت و اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ تاریخی دستاویزات میں اگر کوئی بات عقیدوں کے بارے میں شبہات پیدا کرنے والی ہو تو ان کی تکذیب شروع کر دی جاتی ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر منحرف عقیدے رکھنے والوں کے خلاف مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ پھانسیاں گاڑ دی جاتی ہیں اور نظر بندی کے کیمپ بنا دیے جاتے ہیں۔ میں اس شخص کی قدر کر سکتا ہوں جو یہ کہے کہ مذہب سچا ہے، لہٰذا ہم کو اس پر ایمان رکھنا چاہیے (اور سچائی ثابت کرے)، لیکن ان لوگوں کے لیے میرے دل میں گہری نفرت کے سوا کچھ نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب کی سچائی کا مسئلہ اٹھانا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے اور یہ کہ ہم کو مذہب اس لیے قبول کر لینا چاہیے کہ وہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر سچائی کی توہین کرتا ہے، اس کی اہمیت کو ختم کر دیتا ہے اور جھوٹ کی بالادستی قائم کر دیتا ہے۔... اشتراکیت کی برائیاں وہی ہیں جو ایمان کے زمانوں میں مسیحیت میں پائی جاتی تھیں۔ سوویت خفیہ پولیس کے کارنامے، رومن کیتھولک کلیسا کی قرون وسطیٰ کی عدالت، احتساب کے کارناموں سے صرف مقداری طور پر ہی مختلف تھے۔ جہاں تک ظلم وستم کا تعلق ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس پولیس نے روسیوں کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کو ایسا ہی نقصان پہنچایا جیسا کہ مذہبی احتساب کی عدالت نے مسیحی اقوام کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کو پہنچایا تھا۔ اشترا کی تاریخ کی تکذیب کرتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ تک چرچ بھی یہی کام کیا کرتا تھا.... جب دو سائنس دانوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو وہ اختلاف کو دور کرنے کے لیے ثبوت تلاش کرتے ہیں۔ جس کے حق میں ٹھوس اور واضح ثبوت مل جاتے ہیں، وہ راست قرار پاتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ سائنس دان ہونے کی حیثیت سے ان دونوں میں سے کوئی بھی خود کو بے خطا خیال نہیں کرتا۔ دونوں سمجھتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب دو مذہبی علما میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو وہ دونوں اپنے آپ کو مبرا عن الخطا خیال کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ دونوں میں سے ہر ایک کو یقین ہوتا ہے کہ صرف وہی راستی پر ہے۔ لہٰذا ان کے درمیان فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ بس یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کرنے لگتے ہیں، کیونکہ دونوں کو یقین ہوتا ہے کہ دوسرا نہ صرف غلطی پر ہے، بلکہ راہ حق سے ہٹ جانے کے باعث گناہ گار بھی ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور نظری مسائل حل کرنے کے لیے دنگا فساد تک نوبت جا پہنچتی ہے۔'' (لوگوں کو سوچنے دو، برٹرینڈ رسل، اردو ترجمہ قاضی جاوید ۸۱۔۸۶)

اسی دوران میں ڈی ازم (Deism) کی تحریک بھی پیدا ہوئی۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ خدا ہی نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے، لیکن اس کے بعد وہ اس سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اب یہ کائنات خود بخود ہی چل رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس تحریک کا ہدف رسالت اور آخرت کا انکار تھا۔ اس تحریک کو فروغ ڈیوڈ ہیوم اور مڈلٹن کے علاوہ مشہور ماہر معاشیات ایڈم سمتھ کی تحریروں سے بھی ملا۔ ان لوگوں نے بھی چرچ پر اپنی تنقید جاری رکھی اور چرچ کا جبر و تشدد جاری رہا۔ تقریباً دو سو سال تک یہ تحریک بھی موجود رہی۔ کلیسا کے انتہا درجے کے جبر و تشدد کا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اہل علم میں بالعموم انکار خدا کی لہر چل نکلی جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ترکی کے مشہور عالم ہارون یحییٰ کے الفاظ میں:

''یقیناً الحاد یعنی وجود خدا سے انکار کا نظریہ پرانے وقتوں میں بھی موجود رہا ہے، لیکن اٹھارہویں صدی میں کچھ مخالف مذہب مفکرین کے فلسفے کے پھیلاؤ اور سیاسی اثرات سے اس کا عروج شروع ہوا۔ مادیت پرستوں جیسے ڈائڈرٹ اور بیرن ڈی ہالبیک نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کائنات مادے کا ایسا مجموعہ ہے جو ہمیشہ سے ایسے ہی موجود ہے اور اس کا کوئی نقطۂ آغاز نہیں۔ انیسویں صدی میں الحاد مزید پھیلا۔ بڑے بڑے ملحد مفکرین جیسے مارکس، اینجلز، نٹشے، ڈرخم اور فرائڈ نے سائنس اور فلسفے کی مختلف شاخوں کے علم کو الحادی بنیادوں پر منظم کیا۔ (ان میں سے مارکس اور اینجلز ماہر معاشیات (Economists)، نٹشے ماہر فلسفہ (Philosop her)، ڈرخم ماہر عمرانیات (Sociologist) اور فرائڈ ماہر نفسیات (Psychologist) تھے۔) الحاد کو سب سے زیادہ مدد (ماہر حیاتیات Biologist) چارلس ڈارون سے ملی جس نے تخلیق کائنات کے نظریے کو رد کر کے اس کے برعکس ارتقا (Evolution) کا نظریہ پیش کیا۔ ڈارون نے اس سائنسی سوال کا جواب دے دیا تھا جس نے صدیوں سے ملحدین کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ سوال یہ تھا کہ ''انسان اور جان دار اشیا کس طرح وجود میں آتی ہیں؟'' اس نظریے کے نتیجے میں بہت سے لوگ اس بات کے قائل ہو گئے کہ فطرت میں ایسا آٹومیٹک نظام موجود ہے جس کے نتیجے میں بے جان مادہ حرکت پزیر ہو کر اربوں کی تعداد میں موجود جان دار اشیا کی صورت اختیار کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک ملحدین کائنات کے بارے میں ایک ایسا نقطۂ نظر (worldview) بنا چکے تھے جو ان کے نزدیک اس کائنات سے متعلق ہر ایک سوال کا جواب دیتا تھا۔ انھوں نے کائنات کی تخلیق کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ایسے ہی موجود ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ اس کائنات کا کوئی مقصد نہیں۔ اس میں جو توازن پایا جاتا ہے، وہ محض ایک اتفاقی امر ہے۔ انھیں یہ یقین ہو گیا کہ جان دار اشیا کے وجود پزیر ہونے کا سوال ڈارون نے حل کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں تاریخ اور عمرانیات سے متعلق ہر مسئلے کی تشریح مارکس اور ڈرخم نے کر دی ہے اور ملحدانہ بنیادوں پر فرائڈ نے ہر نفسیاتی سوال کا جواب دے دیا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

(www.yahyah.org، Harun Yahya، The Fall of Atheism)

اسی الحاد کی بنیاد پر سیکولرازم کا نظریہ وجود پزیر ہوا جو مذہب اور الحاد کے درمیان ایک عملی تطبیق (Reconcilation) کی حیثیت رکھتا تھا۔فلسفیانہ اور ملحدانہ نظریات نے اہل یورپ کی اشرافیہ کو بری طرح متاثر کر دیا تھا۔ ان کے ہاں تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب ہی ملحد اور لا دین ہونا تھا۔ دوسری طرف عوام الناس میں اہل مذہب کا اثر ورسوخ خاصی حد تک باقی تھا۔

اہل مذہب کا ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ بہت سے فرقوں میں منقسم تھے اور ایک فرقے کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ دوسرے کی بالا دستی قبول کر سکے۔ ان حالات میں انھوں نے یہ طے کر لیا کہ ہر فرد کو اپنی ذات میں تو اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی دی جائے، لیکن اجتماعی اور ریاستی سطح پر مذہب سے بالکل لاتعلق ہو کر خالص عقل و دانش اور جمہوریت کی بنیادوں پر نظام حیات کو مرتب کر لیا جائے۔ اگر حکومت کا کوئی سرکاری مذہب ہو بھی تو اس کی حیثیت محض نمایشی ہو، اسے معاملات زندگی سے کوئی سروکار نہ ہو۔

سیکولرازم کے اس نظریے کا فروغ دراصل مذہب کی بہت بڑی شکست اور الحاد کی بہت بڑی فتح تھی۔ اہل مغرب نے اپنے سیاسی، عمرانی اور معاشی نظاموں کو مذہب کی روشنی سے دور ہو کر خالصتاً ملحدانہ بنیادوں پر استوار کیا۔ مذہب کو چرچ تک محدود کر دیا گیا۔ تمام قوانین جمہوری بنیادوں پر بنائے جانے لگے۔ عیسائیت میں بھی فری سیکس گناہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن جمہوری اصولوں کے مطابق اکثریت کی خواہش پر اسے جائز قرار دیا گیا حتیٰ کہ ہم جنس پرستی کو بھی قانونی مقام دیا گیا اور ایک ہی جنس میں شادی کو بھی قانونی ٹھہرا لیا گیا۔ سود ہمیشہ سے آسمانی مذاہب میں ممنوع رہا ہے، لیکن معیشت کا پورا نظام سود پر قائم کیا گیا۔ سیکولرازم کے نتیجے میں الحاد اہل مغرب کے نظام حیات میں غالب قوت بن گیا۔ ان کی اکثریت اگرچہ اب بھی خدا کی منکر نہیں ہے، لیکن عملی اعتبار سے وہ نبوت و رسالت اور آخرت کا انکار کر چکی ہے۔ اگر کوئی مذہب کو حق مانتا ہے تو پھر یہ لازم ہے کہ وہ اسے اپنی پرائیویٹ لائف کے ساتھ ساتھ پبلک لائف میں بھی اپنائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو خدا کو ماننے کے باوجود وہ عملاً خدا، نبوت اور آخرت کا انکار کر کے الحاد کو اختیار کر ہی چکا ہے۔ اب اس کے بعد صرف انسانی اخلاقیات یا دین فطرت ہی باقی رہ جاتا ہے جسے ملحدین بھی مانتے ہیں۔ اہل مغرب اگرچہ ان میں سے بہت سے اصولوں کو چھوڑ چکے ہیں، لیکن اب بھی وہ ان اخلاقی اصولوں کے بڑے حصے کو اپنائے ہوئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.almawrid.org

مسلم معاشروں میں الحاد کا فروغ

پندرہویں اور سولہویں صدی میں اہل یورپ اپنے ممالک سے نکل کر مشرق و مغرب میں پھیلنا شروع ہوئے۔ انیسویں صدی کے آخر تک وہ دنیا کے بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے۔ ان کی نوآبادیات میں مسلم ممالک کی اکثریت بھی شامل تھی۔ اہل یورپ نے ان ممالک پر صرف اپنا سیاسی اقتدار ہی قائم نہیں کیا، بلکہ ان میں اپنے الحادی نظریات کو بھی فروغ دیا۔ مغربی ملحدین نے عیسائیت کی طرح اسلام کی اساسات پر بھی حملہ کیا۔ مسلم ممالک میں ان کے نظریات کے جواب میں چار طرح کے ردعمل سامنے آئے:

۱۔ مغربی الحاد کی پیروی

۲۔ مغرب کو مکمل طور پر رد کر دینا

۳۔ مغرب کی پیروی میں اسلام میں تبدیلیاں کرنا

۴۔ مغرب کے مثبت پہلو کو لے کر اسے اسلامی سانچے میں ڈھالنا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پہلا ردعمل مسلمانوں کی اشرافیہ (Elite) کا تھا۔ ان کی اکثریت نے اہل مغرب اور ان کے الحاد کو کلی یا جزوی طور پر قبول کر لیا۔ اگرچہ اپنے نام اور بنیادی عقائد کی حد تک وہ مسلمان ہی تھے، لیکن اپنی اجتماعی زندگی میں وہ الحاد اور لادینیت کا نمونہ تھے۔ بیسویں صدی کے وسط میں آزادی کے بعد بھی ان کی یہ روش برقرار رہی۔ ان میں سے بعض تو اسلام کی تعلیمات کے کھلم کھلا مخالف تھے جن میں ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا، ایران کے رضا شاہ پہلوی، تیونس کے حبیب بورغیبہ اور پاکستان کے جنرل یحییٰ خان شامل ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی اکثریت نے اگرچہ اسلام کا کھلم کھلا انکار نہیں کیا، لیکن وہ عملی طور پر الحاد ہی سے وابستہ رہے۔ چونکہ مسلم عوام کی اکثریت کا سیاسی و معاشی مفاد انھی کی پیروی میں تھا، اس لیے عوام الناس میں الحاد پھیلتا چلا گیا۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

دوسرا ردعمل روایتی مسلم علما کا تھا۔ انھوں نے اہل مغرب کے نظریات کو یک سر مسترد کر دیا۔ انھوں نے مغربی زبانوں کی تعلیم، مغربی علوم کے حصول، مغربی لباس کے پہننے اور اہل مغرب کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق کو حرام قرار دیا۔ انھوں نے اپنے مدارس کے ماحول کو قرون وسطیٰ کے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دور جدید میں کسی مسئلے پر اجتہادی انداز میں سوچنے کے بجائے قدیم ائمہ کی حرف بہ حرف تقلید پر زور دیا۔ برصغیر میں اس نقطۂ نظر کو ماننے والے بڑے بڑے علما میں قاسم نانوتوی، محمود الحسن اور احمد رضا خان بریلوی شامل تھے، جن کے نقطۂ نظر کو پورے ہندوستان کے دینی مدارس نے قبول کیا۔ اگرچہ ان علما میں کچھ مسلکی اور فقہی اختلافات موجود تھے،

لیکن مغرب کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بالکل یکساں تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض مغربی زبانیں سیکھنے اور مغربی علوم کے حصول کے مخالف نہ تھے، لیکن عملاً ان کا رویہ اس سے دوری ہی کا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں ان کا اثر ونفوذ کم سے کم تر ہوتا چلا گیا اور ان کے نقطۂ نظر کو ماضی کی چیز سمجھ لیا گیا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان سے بے زار ہونے لگا اور آہستہ آہستہ یا تو پہلے نقطۂ نظر کو قبول کر کے الحاد کی طرف چلا گیا یا پھر اس نے تیسرے اور چوتھے نقطۂ نظر کو قبول کیا۔ معاشرے میں ان کا کردار یہی رہ گیا کہ وہ مسجد میں نماز پڑھا دیں، کسی کے گھر میں ختم قرآن کر دیں یا پھر نکاح، بچے کی پیدایش اور جنازے کے وقت چند رسومات ادا کر دیں۔ عملی زندگی میں ان کے کردار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے وقت لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے یہ انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ کب مولوی صاحب وعظ ختم کریں اور وہ مسجد میں جا کر نماز جمعہ ادا کریں۔ جیسے ہی وعظ ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے، لوگ جوق در جوق مسجد کی طرف آنے لگتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے وعظ اور تقاریر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انھی روایتی علما میں سے بعض نے جدید دنیا کے علوم سے واقفیت حاصل کر کے عصر حاضر کے زندہ مسائل کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ عام روایتی علما کی نسبت ان کا اثر ونفوذ معاشرے میں بہت زیادہ ہے اور ان کی دعوت کو سننے والے افراد کی کوئی کمی نہیں۔

اس دور میں امت مسلمہ کی علمی وفکری قیادت برصغیر اور مصر کے اہل علم کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ بعض مسلمان مفکرین نے اسلام اور جدید الحادی نظریات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے اسلام کے بعض بنیادی عقائد واعمال کا بھی انکار کر دیا۔ اس نقطۂ نظر کو ماننے اور پھیلانے والوں میں ہندوستان کے سر سید احمد خان، اور مصر کے محمد عبدہ، طٰہٰ حسین اور سعد زغلول شامل ہیں۔ اسی فکر کو بیسویں صدی میں غلام احمد پرویز اور ان کے شاگرد ڈاکٹر عبدالودود نے پیش کیا۔ روایتی اور چوتھے نقطۂ نظر کے حامل علما کے اثر ورسوخ کے پیش نظر اس فکر کو مسلم معاشروں میں عام مقبولیت حاصل نہ ہو سکی تاہم اس سے اشرافیہ کا ایک اہم حلقہ ضرور متاثر ہوا۔

چوتھا ردعمل ان اہل علم کا تھا جو روایتی علما کے قدیم علمی ورثے کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے مغرب کے الحادی افکار پر کڑی نکتہ چینی کی اور تیسرے نقطۂ نظر کے حامل علما کے برعکس اسلام کو معذرت خواہانہ انداز کے بجائے باوقار طریقے سے پیش کیا۔ انھوں نے روایتی علما پر تنقید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت تو ناقابل تغیر ہے، لیکن قرون وسطیٰ کے علما نے اپنے ادوار کے تقاضوں کے مطابق جو قانون سازی کی تھی، اس کی تشکیل نو (Reconstruction) کی ضرورت ہے۔ روایتی علما کے برعکس

انھوں نے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول پر زور دیا۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین میں ہندوستان کے اہل علم میں سے محمد اقبال، ابوالکلام آزاد، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، حمید الدین فراہی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مصر کے علما میں رشید رضا، حسن البنا اور سید قطب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ممالک کے جدید اہل علم نے انھی کی پیروی کی۔ اسی نقطۂ نظر کے حاملین نے عالم اسلام میں بڑی بڑی تحریکیں برپا کیں جنھوں نے جدید طبقے کو اسلام سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ روایتی علما کی نسبت انھیں تعلیم یافتہ طبقے میں کافی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کے اثرات اپنے اپنے معاشروں پر نہایت گہرے ہیں۔

مغربی اور مسلم معاشروں پر الحاد کے اثرات

الحاد کے اس عروج نے مغربی اور مسلم معاشروں پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہو گا کہ انھوں نے قدیم ورثے کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا اور عیسائیت اور اسلام کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج پیدا کر دیا۔ ہم الحاد کے اثرات کو نظریات، فلسفے، سیاست، معیشت، معاشرت اور اخلاق، ہر پہلو میں نمایاں طور پر محسوس کر سکتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عقائد، فلسفہ اور نظریات

سب سے پہلے ہم نظریاتی اور فلسفیانہ پہلو کو لیتے ہیں۔ الحاد نے عیسائیت اور اسلام کے بنیادی عقائد یعنی وجود باری تعالیٰ، رسالت اور آخرت پر حملہ کیا اور اس کے بارے میں شکوک وشبہات پھیلائے۔ خدا کے وجود سے انکار کر دیا گیا، رسولوں کے تاریخی وجود ہی کا انکار کر دیا گیا اور آخرت سے متعلق طرح طرح کے سوالات اٹھائے گئے۔ اس ضمن میں ملحدین کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ یہ تینوں عقائد مابعد الطبیعیاتی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں جسے اس دنیا کے مشاہداتی اور تجرباتی علم کی روشنی میں نہ تو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ رد کیا جا سکتا ہے۔ ان ملحدین نے عیسائیت پر ایک اور طرف سے بڑا حملہ کیا اور وہ یہ تھا کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی علما نے اپنے وقت کے کچھ سائنسی اور فلسفیانہ نظریات کو اپنے نظام عقائد (Theology) کا حصہ بنا لیا تھا جیسے زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ جب جدید سائنسی تحقیقات سے یہ نظریات غلط ثابت ہوئے تو بہت سے لوگوں کا پوری عیسائیت پر سے اعتماد اٹھ گیا اور انھوں نے فکری طور پر بھی الحاد کو اختیار کر لیا۔ اسلام میں چونکہ اس قسم کے کوئی عقائد نہیں، لہٰذا اسلام اس قسم کے حملوں سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ الحاد کو مغرب میں تو بہت سے ایسے پیروکار مل گئے جو

ہر قسم کے مذہب سے بے زاری کا اعلان کر کے خود کو فخریہ طور پر ملحد(Atheist) کہتے ہیں، لیکن مسلمانوں میں انھیں ایسے پیروکار بہت کم مل سکے۔ مسلمانوں میں صرف ایسے چند لوگ ہی پیدا ہوئے جو عام طور پر کمیونسٹ پارٹیوں میں شامل ہوئے۔ اگر ہم کمیونسٹ تحریک سے وابستہ نسلی مسلمانوں کا جائزہ لیں تو ان میں سے بھی بہت کم ایسے ملیں گے جو خود کو کھلم کھلا دہریہ یا ملحد کہلوانے پر تیار ہوں۔

عیسائیت پر ملحدین کا ایک اور بڑا حملہ یہ تھا کہ انھوں نے انبیاے کرام، بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود سے انکار کر دیا۔ انھوں نے آسمانی صحیفوں بالخصوص بائیبل کو قصے کہانیوں کی کتاب قرار دیا۔ اس الزام کا کامیاب دفاع کرتے ہوئے کچھ عیسائی ماہرین آثار قدیمہ نے اپنی زندگیاں وقف کر کے علمی طور پر یہ بات ثابت کر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک تاریخی شخصیت ہیں اور بائیبل محض قصے کہانیوں کی کتاب ہی نہیں، بلکہ اس میں بیان کیے گئے واقعات تاریخی طور پر مسلم ہیں اور ان کا ثبوت آثار قدیمہ کے علم سے بھی ملتا ہے۔ یہ الحاد کے مقابلے میں عیسائیت کی بہت بڑی فتح تھی۔ اسلام کے معاملے میں ملحدین ایسا نہ کر سکے کیونکہ قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت کو چیلنج کرنا ان کے لیے علمی طور پر ممکن نہ تھا۔ انھوں نے اسلام پر حملہ کرنے کی دوسری راہ نکالی۔ ان میں سے بعض کوتاہ قامت اور علمی بد دیانتی کے شکار افراد نے چند من گھڑت روایات کا سہارا لے کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی کردار پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے، کیونکہ ان من گھڑت روایات کی علمی و تاریخی حیثیت کو مسلم علما نے احسن انداز میں واضح کر دیا جسے انصاف پسند ملحد محققین نے بھی تسلیم کیا۔ ان محققین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ خدا کی ذات کے متعلق جو شکوک و شبہات ان ملحدین نے پھیلائے تھے، اس کی بنیاد چند سائنسی نظریات پر تھی۔ بیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات جو خود ان ملحدین کے ہاتھوں ہوئیں، نے یہ بات واضح کر دی کہ جن سائنسی نظریات پر انھوں نے اپنی عمارت تعمیر کی تھی، بالکل غلط ہیں۔ اس طرح ان کی وہ پوری عمارت اپنی بنیاد ہی سے منہدم ہو گئی جو انھوں نے تعمیر کی تھی۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کر رہے ہیں۔

سیاست

فکری اور نظریاتی میدان میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ الحاد اسلام کے مقابلے میں ناکام رہا، مگر عیسائیت کے مقابلے میں اسے جزوی فتح حاصل ہوئی، البتہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی میدانوں میں الحاد کو مغربی اور مسلم دنیا میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ سیاسی میدان میں الحاد کی سب سے بڑی کامیابی سیکولرازم کا فروغ ہے۔ پوری مغربی دنیا

اور مسلم دنیا کے بڑے حصے نے سیکولرازم کو اختیار کر لیا۔ سیکولرازم کا مطلب ہی یہ ہے کہ مذہب کو گرجے یا مسجد تک محدود کر دیا جائے اور کاروبار زندگی کو خالصتاً انسانی عقل کی بنیاد پر چلایا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کا کوئی حصہ نہ ہو۔ مغربی دنیا نے تو سیکولرازم کو پوری طرح قبول کر لیا اور اب اس کی حیثیت ان کے ہاں ایک مسلمہ نظریے کی ہے۔ انھوں نے اپنے مذہب کو گرجے کے اندر محدود کر کے کاروبار حیات کو مکمل طور پر سیکولر کر لیا ہے۔ چونکہ اہل مغرب کے زیر اثر مسلمانوں کی اشرافیہ بھی الحاد کے اثرات کو قبول کر چکی تھی، اس لیے ان میں سے بھی بہت سے ممالک نے سیکولرازم کو بطور نظام حکومت کے قبول کر لیا۔ بعض ممالک جیسے ترکی اور تیونس نے تو اسلام سے کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کیا، لیکن مسلم ممالک کی اکثریت نے سیکولرازم اور اسلام کا ایک ملغوبہ تیار کرنے کی کوشش کی جس میں بالعموم غالب عنصر سیکولرازم کا تھا۔

الحاد کو فروغ جمہوریت کے نظریے سے بھی ہوا۔ اگرچہ جمہوریت عملی اعتبار سے اسلام کے مخالف نہیں، کیونکہ اسلام میں بھی آزادی رائے اور شوریٰ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن جمہوریت جن نظریاتی بنیادوں پر قائم ہے، وہ خالصتاً ملحدانہ ہے۔ جمہوریت کی بنیاد حاکمیت جمہور کے نظریے پر قائم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عوام کی اکثریت خدا کی مرضی کے خلاف فیصلہ دے دے تو ملک کا قانون بنا کر اس فیصلے کو نافذ کر دیا جائے۔ اس کی واضح مثال ہمیں اہل مغرب کے ہاں ملتی ہے، جہاں اپنے دین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے انھوں نے فری سیکس، ہم جنس پرستی، شراب اور سود کو حلال کر لیا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اس کی مثال شاید ترکی ہی میں مل سکتی ہے۔ اسلام نظریاتی طور پر جمہوریت کے مغربی تصور کا شدید مخالف ہے۔ اسلام کے مطابق حاکمیت اعلیٰ جمہور کا حق نہیں، بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اسلام کی نظر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنا شرک ہے۔ سب سے بڑا اقتدار (Sovereignty) صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس کے برعکس جہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی ہدایت نہیں دی، وہاں عوام کی اکثریتی رائے اور مشورے سے فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ اکثریت کی مرضی کے خلاف اس پر اقلیتی رائے کو مسلط کرنا اسلام میں درست نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہر معاملہ مشورے سے طے کریں۔

معیشت

معیشت کے باب میں الحاد نے دنیا کو دو نظام دیے۔ ان میں سے ایک ایڈم سمتھ کا سرمایہ دارانہ نظام یا کیپیٹل ازم اور دوسرا کارل مارکس کی اشتراکیت یا کمیونزم۔ کیپیٹل ازم دراصل جاگیردارانہ نظام (Feudalism)

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

ہی کی ایک نئی شکل ہے جو نسبتاً جاگیردارانہ نظام سے کچھ بہتر ہے۔ کیپیٹل ازم میں مارکیٹ کو مکمل طور پر آزاد چھوڑا جاتا ہے جس میں ہر شخص کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ دولت کے جتنے چاہے انبار لگا لے۔ جس شخص کو دولت کمانے کے لامحدود مواقع میسر ہوں، وہ امیر سے امیر تر ہوتا جائے گا اور جسے یہ مواقع میسر نہ ہوں، وہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا جائے گا۔ حکومت اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ جاگیردارانہ نظام کی طرح اس نظام میں بھی سرمایہ دار، غریب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس کا استحصال کرتا ہے۔ غریب اور امیر کی خلیج اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ ایک طرف گھی کے چراغ جلائے جاتے ہیں اور دوسری طرف کھانے کو دال بھی میسر نہیں ہوتی۔ ایک طرف ایک شخص ایک وقت کے کھانے پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتا ہے اور دوسری طرف ایک شخص کو بھوکا سونا پڑتا ہے۔ ایک طرف علاج کے لیے امریکہ یا یورپ جانا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور دوسری طرف ڈسپرین خریدنے کی رقم بھی نہیں ہوتی۔ ایک طرف بچوں کو تعلیم کے لیے ترقی یافتہ ممالک کی یونیورسٹیوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور دوسری طرف بچوں کو سرکاری سکول میں تعلیم دلانے کے لیے بھی ماں باپ کو فاقے کرنا پڑتے ہیں۔ ایک طرف محض ایک لباس سلوانے پر لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں اور دوسری طرف استعمال شدہ کپڑے خریدنے کے لیے بھی پیٹ کاٹنا پڑتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اس تفاوت کی مکمل ذمہ داری الحاد پر ہی نہیں ڈالی جا سکتی، کیونکہ اس کا پیش رو نظام فیوڈل ازم، جو کہ اس سے بھی زیادہ استحصالی نظام ہے، اس دور میں ارتقا پذیر ہوا جب مغربی دنیا میں عیسائی علما اور مسلم دنیا میں مسلم علما طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ عیسائی تھیوکریسی اور مسلم علما نے جاگیردارانہ نظام کے ظلم وستم اور استحصال کے خلاف کبھی موثر جدوجہد نہیں کی، بلکہ اپنے ادیان کی تعلیمات کے برعکس وہ اس کے سرپرست بنے رہے۔ اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد فیوڈل ازم کی کوکھ سے کیپیٹل ازم نے جنم لیا، جو کہ امیر کے ہاتھوں غریب کے استحصال کا ایک نیا نظام تھا، لیکن اس کا استحصالی پہلو فیوڈل ازم کی نسبت کم تھا، کیونکہ وہاں تو بہتر مستقبل کی تلاش میں غریب کسی اور جگہ جا بھی نہیں سکتا۔ چونکہ اہل مغرب اور اہل اسلام اپنے دین کی تعلیمات سے خاصے دور ہو چکے تھے، اس لیے یہ نظام اپنے پورے استحصالی رنگ میں پنپتا رہا۔ یورپ میں کارل مارکس نے کیپیٹل ازم کے استحصال کے خلاف ایک عظیم تحریک شروع کی جس میں اس نظام کی معاشی ناہمواریوں پر زبردست تنقید کی گئی۔ مارکس اور ان کے ساتھی فریڈرک اینجلز، جو بہت بڑے ملحد فلسفی تھے، نے پوری تاریخ کی ایک نئی تشریح (Interpretation) کی جس میں انھوں نے معاش ہی کو انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کا محور و مرکز قرار دیا۔ ان کے نزدیک تاریخ کی تمام جنگیں، تمام مذاہب اور تمام سیاسی نظام معاشیات ہی کی پیداوار تھے۔ انھوں

www.al-mawrid.org / www.javedahmadghamidi.com

نے خدا، نبوت اور آخرت کے عقائد کا انکار کرتے ہوئے دنیا کو ایک نیا نظام پیش کیا جسے تاریخ میں کمیونزم کے نام سے یاد رکھا جائے گا۔ کمیونزم کا نظام خالصتاً الحادی نظام تھا۔

کمیونسٹ نظام انفرادی ملکیت کی مکمل نفی کرتا ہے اور تمام ذرائع پیداوار، جن میں زراعت، صنعت، کان کنی اور تجارت شامل ہے، کو مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں دے دیتا ہے۔ پوری قوم ہر معاملے میں حکومت کے فیصلوں پر عمل کرتی ہے جو کہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کمیونسٹ جدوجہد پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اسے سب سے پہلے کامیابی روس میں ہوئی جہاں لینن کی قیادت میں ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا اور دنیا کی پہلی کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی۔ دوسرا بڑا ملک جس نے کمیونزم کو قبول کیا، چین تھا۔ باقی ممالک نے کمیونزم کی تبدیل شدہ صورتوں کو اختیار کیا۔ کمیونزم کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس میں فرد کے لیے کوئی محرک (Incentive) نہیں ہوتا جس سے وہ اپنے ادارے کے لیے اپنی خدمات کو اعلیٰ ترین انداز میں پیش کر سکے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کر سکے۔ اس کے برعکس کیپٹل ازم میں ہر شخص اپنے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور اس سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے اور اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتیں استعمال کرتا ہے۔ کمیونزم کی دوسری بڑی خامی یہ تھی کہ پورے نظام کو جبر کی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور شخصی آزادی بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوویت یونین کی معیشت کمزور ہوتی گئی اور بالآخر ۹۱۔۱۹۹۰ء میں یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ اس کے بعد اسے کیپٹل ازم ہی کو اپنانا پڑا۔ دوسری طرف چین کی معیشت کا حال بھی پتلا تھا۔ چین نے اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے کمیونزم کو خیرباد کہہ دیا اور تدریجاً اپنی مارکیٹ کو اوپن کر کے کیپٹل ازم کو قبول کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کیپٹل ازم اور کمیونزم، دونوں نظام ہائے معیشت ہی استحصال پر مبنی نظام ہیں۔ ایک میں امیر غریب کا استحصال کرتا ہے اور دوسرے میں حکومت اپنے عوام کا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اہل مغرب نے اعلیٰ ترین اخلاقی اصولوں کو اپنا کر کیپٹل ازم کے استحصالی نقصانات کو کافی حد تک کم کر لیا ہے، لیکن تیسری دنیا جس کی اخلاقی حالت بہت کمزور ہے، وہاں اس کے نقصانات کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہاں ہم الحاد کی تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں، اس لیے یہ کہنا مناسب ہو گا کہ پچھلی تین صدیوں میں معیشت کے میدان میں الحاد کو دنیا بھر میں واضح برتری حاصل رہی ہے اور دنیا نے الحاد پر قائم دو نظام ہائے معیشت یعنی کیپٹل ازم اور کمیونزم کا تجربہ کیا ہے۔ کمیونزم تو اپنی عمر پوری کر کے تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، اس لیے اس پر ہم زیادہ بحث نہیں کرتے، لیکن کیپٹل ازم کے چند اور پہلوؤں کا ایک مختصر جائزہ لینا ضروری ہے جو انسانیت کے لیے ایک خطرہ ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کیپیٹل ازم کے نظام کی بنیاد سود پر ہے۔ بڑی بڑی صنعتوں کے قیام اور بڑے بڑے پراجیکٹس کی تکمیل کے لیے وسیع پیمانے پر فنڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک سرمایہ دار کے لیے اتنی بڑی رقم کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر اس کے پاس اتنی رقم موجود بھی ہو تو اسے ایک ہی کاروبار میں لگانے سے کاروباری خطرہ یا رسک بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ ایک کاروبار اگر ناکام ہو جائے تو پوری کی پوری رقم ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر وہی رقم تھوڑی تھوڑی کر کے مختلف منصوبوں میں لگائی جائے تو ایک منصوبے کی ناکامی سے پوری رقم ڈوبنے کا خطرہ نہیں ہوتا اور تمام کے تمام منصوبوں کے ڈوبنے کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ اسے علم مالیات (Finance) کی اصطلاح میں Diversification کہا جاتا ہے۔ ان بڑے بڑے پراجیکٹس کے لیے رقم کی فراہمی کے لیے دنیا نے Financial Intermediaries کا نظام وضع کیا ہے۔ اس درمیانی واسطے کا سب سے بڑا حصہ بینکوں پر مشتمل ہے۔ یہ بینک عوام الناس کی چھوٹی چھوٹی بچت کی رقوم کو اکٹھا کرنے کا کام کرتے ہیں جس پر بینک انھیں سود ادا کرتا ہے۔ پورے ملک کے لوگوں کی تھوڑی تھوڑی بچتوں کو ملا کر بہت بڑی تعداد میں فنڈ اکٹھا کر لیا جاتا ہے جو انھی سرمایہ داروں کو کچھ زیادہ شرح سود پر دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر بینک عوام کو 8% سود کی ادائیگی کر رہا ہے تو سرمایہ دار سے 10% سود وصول کر رہا ہوگا۔ اس 2% میں بینک اپنے انتظامی اخراجات پورے کر کے بہت بڑا منافع بھی کما رہا ہوتا ہے۔ سرمایہ دار عموماً اپنے سرمایے کو ایسے کاروبار میں لگاتے ہیں جو اس سرمایے پر بہت زیادہ منافع دے سکے۔ اگر ہم دنیا بھر کی مختلف کمپنیوں کے سالانہ اکاؤنٹس (Annual Accounts) کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میں ایسے کاروبار بھی ملیں گے جن میں سرمایہ پر منافع (Return on Capital Employed) کی شرح 50% سالانہ، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ اس منافع کا ایک معمولی سا حصہ بطور سود ان غریب لوگوں کے حصے میں بھی آتا ہے جن کا سرمایہ دراصل اس کاروبار میں لگا ہوتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھ لیجیے کہ بالفرض ایک سرمایہ دار کسی بینک سے ایک ارب روپے 10% سالانہ شرح سود پر لیتا ہے اور اس سرمائے سے پچاس کروڑ روپے سالانہ نفع کماتا ہے۔ اس میں سے وہ دس کروڑ بینک کو بطور سود ادا کرے گا اور بینک اس میں ۸% سالانہ کے حساب سے آٹھ کروڑ روپے اپنے کھاتہ داروں (Deposit Holders) کو ادا کرے گا۔ چونکہ یہ کھاتہ دار بہت بڑی تعداد میں ہوں گے جنھوں نے اپنی تھوڑی تھوڑی بچت بینک میں جمع کروائی ہوگی، اس لیے ان میں سے ہر ایک کے حصے میں چند ہزار یا چند سو روپے سے زیادہ نہیں آئے گا۔ اس طریقے سے سرمایہ دار، عام لوگوں کو چند ہزار روپے پر ٹرخا کر ان کا پیسا استعمال کرتا ہے اور اسی پیسے سے خود کروڑوں روپے بنا لیتا ہے۔ اس مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس طرح

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جاگیردارانہ نظام میں جاگیردار یا مہاجن غریبوں کو سود پر رقم دے کر ان کا استحصال کیا کرتا تھا، اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار غریبوں سے سود پر رقم لے کر ان کا استحصال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فیوڈل ازم کے مہاجنی سود کا سلسلہ بھی اس نظام میں پوری طرح جاری ہے جس میں کریڈٹ کارڈز کے ذریعے Micro-Financing کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معاملے میں 36% سالانہ کے حساب سے سود بھی وصول کیا جا رہا ہے۔ اس سود میں سے صرف 8-10% اپنے کھاتہ داروں کو ادا کیا جا رہا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی ایک اور خصوصیت جوئے کا فروغ ہے۔ یہ لعنت فیوڈل ازم میں بھی اسی طرح پائی جاتی تھی۔ دنیا بھر میں جوا کھیلنے کے بڑے بڑے ادارے قائم کیے جا چکے ہیں۔ سٹاک ایکسچینج، فاریکس کمپنیز اور بڑی بڑی کیپیٹل اور منی مارکیٹس ان کیسینوز کے علاوہ ہیں جہاں بڑی بڑی رقوم کا سٹہ کھیلا جاتا ہے۔ کھربوں روپے سٹے میں برباد کر دیے جاتے ہیں، مگر بھوک سے مرنے والے بچوں کا کسی کو خیال نہیں آتا۔ ان کیسینوز میں جوئے کے ساتھ ساتھ بے حیائی اور بدکاری کو بھی فروغ مل رہا ہے، بلکہ دنیا بھر میں سیاحت کو فروغ دینے کے لیے جوئے اور بدکاری کے مراکز بھی قائم کیے جا چکے ہیں۔ سود اور جوا ایسی برائیاں ہیں جن کا تعلق الحاد کی اخلاقی بنیادوں سے قائم کیا سکتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آ رہی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اخلاق اور معاشرت

الحاد کے اثرات سے جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے، وہ اخلاق انسانی اور نظام معاشرت ہے۔ اگر کوئی یہ مان لے کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے جہاں اسے اپنے کیے کا حساب دینا ہو گا تو پھر سوائے حکومتی قوانین یا معاشرتی دباؤ کے کوئی چیز دنیا میں اسے کسی برائی کو اختیار کرنے سے نہیں روک سکتی۔ پھر اس کی زندگی کا مقصد اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ دولت اور اس سے لطف اندوز ہونا ہی رہ جاتا ہے۔ اگر اسے یقین ہو کہ کوئی اسے نہیں پکڑ سکتا تو پھر کیا حرج ہے کہ وہ اپنے کسی بوڑھے رشتے دار کی دولت کے حصول کے لیے اس کو زہر دے دے؟ اگر وہ اتنا ہوشیار ہو کہ پولیس اس کا سراغ نہیں لگا سکتی ہو تو پھر لاکھوں روپے کے حصول کے لیے چند بم دھماکے کر کے دہشت گرد بننے میں کیا حرج ہے؟ قانون سے چھپ کر کسی کی عصمت دری سے اگر اس کی درندگی کی تسکین ہوتی ہے تو پھر اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ اپنی خواہش کی تسکین کے لیے سو بچوں کو اغوا کر کے، ان سے زیادتی کر کے، انھیں قتل کر کے تیزاب میں گلا سڑا دینے میں آخر کیا قباحت ہے؟ اپنے یتیم بھتیجے کا مال ہڑپ

کر جانے سے آخر کیا فرق پڑتا ہے؟ جھوٹا کلیم داخل کر کے اگر اسے اچھی خاصی جائداد مل سکتی ہے تو وہ ایسا کیوں نہ کرے؟ کسی کو اپنی گاڑی کے نیچے کچلنے کے بعد اسے ہسپتال تک پہنچا کر اپنا وقت برباد کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ جائداد کو تقسیم ہونے سے بچانے کے لیے اگر کوئی اپنی بہن یا بیٹی پر کاروکاری کا الزام لگا کر اسے قتل کر دے تو کیا قیامت برپا ہو جائے گی؟ اپنے دشمنوں کی بہو بیٹیوں کو ننگا کر کے بازاروں میں گھمانے پھرانے سے اگر اس کے انتقامی جذبات سرد پڑتے ہیں تو ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؟ اپنی لاگت کو کم کرنے کے لیے اگر وہ خوراک یا ادویات میں ملاوٹ بھی کر دے اور اس سے خواہ چند لوگ مر بھی جائیں تو کیا ہے، اس کا منافع تو بڑھ جائے گا؟ ذخیرہ اندوزی کر کے اگر کسی کے مال کی قیمتیں چڑھ سکتی ہیں تو وہ ایسا کیوں نہ کرے؟ اگر تیز رفتاری میں کسی کو مزہ آتا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے اگر اس سے کوئی ایک آدھ آدمی مر جائے یا ہمیشہ کے لئے معذور ہو جائے، اتنی enjoyment کے لیے ایک آدھ بندہ مارنا کون سا مسئلہ ہے؟ اگر کوئی کسی کے نظریات سے اختلاف کرے تو اسے گولی مارنے میں کیا قباحت ہے؟ یا پھر یہ سب نہ بھی ہو تو وہ اپنا وقت معاشرے کی خدمت میں کیوں لگائے، وہ اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ enjoyment کے حصول ہی میں کیوں نہ صرف کرے؟ اگر وہ اپنے جرم کو چھپا سکتا ہو تو پھر سرکاری سودوں میں کمیشن کھا کر ملک و قوم کو نقصان پہنچانے میں کیا چیز مانع ہے؟

یہ وہ مثالیں ہیں جو روزانہ ہمارے سامنے اخبارات میں آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم وحشی درندوں کے درمیان اپنی زندگی گزار رہے ہیں جن پر انسان اور مسلمان ہونے کا محض لیبل لگا ہوا ہے۔ کم و بیش اسی قسم کے واقعات دوسرے ممالک میں بھی پیش آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ مسلم دنیا پر بھی الحاد غالب آ چکا ہے۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ مسلمان توحید، رسالت اور آخرت کا کھلم کھلا انکار کر دیں، لیکن عملی طور پر ہم ان حقیقتوں سے غافل ہو چکے ہیں۔ خدا ہے یا نہیں ہے، اس نے اپنے کسی رسول کو اس دنیا میں بھی بھیجا یا نہیں بھیجا، آخرت ہو گی یا نہیں ہو گی، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا ہر عمل پکار پکار کر ہمارے ملحد ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں قانون صرف چند بدمعاشوں ہی کو کنٹرول کر سکتا ہے اور وہ بھی تب جب ان کے جرائم منظر عام پر آ جائیں۔ معاشرہ دباؤ ڈال کر صرف ان لوگوں کی اصلاح کر سکتا ہے جن کے جرائم کا انھیں علم ہو جائے، بشرطیکہ ان لوگوں کی تعداد معاشرے میں آٹے میں نمک کے برابر ہو۔ جو چیز جرائم کی شرح کو کم سے کم کرتی ہے، وہ یہی انسانی اخلاقیات کا شعور ہی تو ہے۔ یہ شعور صرف ایک غالب قوت اور اس کے سامنے جواب دہی کے تصور ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک ملحدانہ معاشرے میں یہ تصور کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ سب سے نمایاں سوال ہے جو الحاد پر کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دنیا بھر کے ملحد مفکرین اور فلسفی اس اخلاقی شعور سے بے بہرہ ہوں۔ اس کے برعکس وہ خود کو اخلاق اور انسانی حقوق کے علم بردار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اس سوال کا پوری طرح جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک فکر آخرت کا نعم البدل یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کے ساتھ اس وجہ سے زیادتی نہ کرے کہ جواب میں وہ بھی زیادتی کر سکتا ہے یعنی دوسرے شخص کے منفی ردعمل سے بچنے کے لیے اس سے زیادتی نہ کی جائے۔ اگر اس اخلاقی معیار کو درست مان لیا جائے تو ایسا صرف اور صرف اس صورت میں ممکن ہے جب دونوں فریق قوت و اقتدار کے اعتبار سے بالکل مساوی درجے پر ہوں۔ ایک طاقت ور شخص اگر کسی سے زیادتی کرے تو اسے جوابی ردعمل کا کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟ اگر غور کیا جائے تو دنیا بھر کے مجرم اور جرائم پیشہ افراد اسی اخلاقی ضابطے کی پیروی کرتے ہیں۔ چوری اور ڈاکے کے بعد لوٹ کا مال آپس میں بڑی دیانت داری سے تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ جوئے میں ہاری ہوئی رقم کو بڑی شرافت سے ادا کر دیا جاتا ہے۔ منشیات فروش اپنا اپنا حصہ بڑی دیانت داری سے ایک دوسرے کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے دیانت دار یہ جرائم پیشہ لوگ پورے معاشرے کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ میرا ساتھی تو کسی طرح مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے، لیکن ایک عام آدمی نہیں۔

الحاد کے اخلاقی اثرات بڑے واضح طور پر تیسری دنیا میں تو دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن دنیا کے ترقی یافتہ حصے میں یہ اثرات اتنے نمایاں نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ الحاد کی تحریک کو سب سے پہلے فروغ مغرب میں حاصل ہوا، لیکن وہاں کے لوگوں کا اخلاقی معیار تیسری دنیا سے نسبتاً بہتر ہے۔ کوئی بھی فلسفہ یا نظام حیات سب سے پہلے معاشرے کے ذہین ترین لوگ تشکیل دیتے ہیں اور پھر اسے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے معاشرے کے ذہین طبقے میں پھیلاتے ہیں جسے عرف عام میں اشرافیہ (Elite) کہتے ہیں۔ یہی طبقہ معاشرے میں تعلیم و ابلاغ کے تمام ذرائع پر قابض ہوتا ہے۔ اس فلسفے یا نظام حیات کو قبول کرنے کے بعد یہ اسے عوام الناس تک پہنچاتا ہے۔ عوام ہر معاملے میں اسی اشرافیہ کے تابع ہوتے ہیں، اس لیے وہ اسے دل و جان سے قبول کر لیتے ہیں۔ اہل مغرب میں الحادی نظریات کے فروغ میں جن ذہین افراد نے حصہ لیا، وہ اخلاقی اعتبار سے کوئی گرے پڑے لوگ نہ تھے۔ انھوں نے خود کو انسانی اخلاق کے علم بردار کی حیثیت سے پیش کیا۔ جدید دور میں الحادی تحریک نے اپنا نام Humanist رکھ لیا ہے اور وہ خود کو اخلاقیات کا چیمپئن سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کونسل فار سیکولر ہیومن ازم کے بانی پال کرٹز اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

''ہمیں تیسری طرف جو جنگ لڑنا ہے، وہ انسانی اخلاقیات کی جنگ ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اخلاقی انقلاب ہی انسانیت

کے مستقبل کی ضمانت دیتا ہے۔ یہی آخرت کی نجات یا جنت کے عقیدے کے بغیر انسانی زندگی کو بہتر بناتا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اخلاقی اقدار کو مشاہدے اور دلائل کی بنیاد پر پرکھیں اور نتائج کی روشنی میں اپنی اخلاقی اقدار میں تبدیلی کرنے پر تیار رہیں۔ ہمارا طریقہ پلینیٹری ہے، جیسا کہ ''Humanist Manifesto 2000'' میں زور دیا گیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سیارے زمین پر ہر انسان بالکل برابر حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاق کے ساتھ ہماری committment یہ ہے کہ عالمی برادری میں ہر فرد کو اس کے حقوق ملیں اور ہم اپنے مشترکہ گھر یعنی اس زمین کی حفاظت کریں۔ انسانی اخلاقیات فرد کی آزادی، پرائیویسی کے حق، انسانی آزادی اور سماجی انصاف کی ضمانت دیتے ہیں۔ اس کا تعلق پوری نسل انسانیت کی فلاح و بہبود سے ہے۔''

(Paul Kurtz, The Secular Humanist Prospect: In Historical Perspective, Free InquiryMagazine,۲۰۰۳, مئی ۲۳/۴)

ان فلسفیوں نے انسانی حقوق اور انسانی اخلاق کو اپنے فلسفے میں بہت اہمیت دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ممالک کے عوام میں اخلاقی شعور نسبتاً بہت بہتر ہے۔ وہ لوگ بالعموم جھوٹ کم بولتے ہیں، اپنے کاروبار میں بددیانتی سے اجتناب کرتے ہیں، ایک دوسرے کا استحصال کم کرتے ہیں، فرد کی آزادی کا احترام کرتے ہیں، جانوروں کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں، یتیموں اور اپاہجوں کے لیے ان کے ہاں منظّم ادارے ہیں، قانون کا احترام کرتے ہیں، ان کی سوچ عموماً منطقی (Rational) ہوتی ہے، وہ عقل و دانش کی بنیاد پر اپنے نظریات کو تبدیل کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، ان کے ہاں ایک دوسرے کو مذہبی آزادی دی جاتی ہے، ایک دوسرے کا احترام کیا جاتا ہے، محض اختلاف رائے کی بنیاد پر کوئی کسی کو گولی نہیں مارتا، علم و دانش کا دور دورہ ہے، اشیا خالص ملتی ہیں اور ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے والے ادارے بہت موثر ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اخلاقی لحاظ سے یہ لوگ فرشتے بن گئے ہیں، بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں میں بہت سی اخلاقی خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے، ان کی خدمت نہیں کرتے، جنسی بے راہ روی ان کے ہاں عام ہے، ان کی اکثریت طرح طرح کے نشے میں سکون تلاش کرتی نظر آتی ہے، ان میں تشدد کا رجحان بڑھتا ہوا نظر آتا ہے، اور بالخصوص ان کے اخلاقی معیارات اپنی قوم کے افراد کے لیے کچھ اور ہیں اور باقی دنیا کے لیے کچھ اور۔ نیشنلزم کا جذبہ بہت طاقت ور ہونے کی وجہ سے یہ اپنی قوم کے افراد کے لیے تو ابریشم کی طرح نرم ہیں اور ہر اخلاقی اصول کی پیروی کرتے ہیں، لیکن جب معاملہ کسی دوسری قوم کے ساتھ ہو تو وہاں انسانی حقوق کے تمام سبق بھول جاتے ہیں۔

جب یہ الحادی نظریات اہل مغرب سے نکل کر مشرقی قوموں میں آئے تو اشرافیہ کے جس طبقے نے انھیں قبول

www.javedahmadghamidi.com

کیا، بدقسمتی سے اس کی اخلاقی حالت نہایت پست تھی۔ جب یہ طبقہ اور اس کے زیر اثر عوام الناس عملی اعتبار سے الحاد کی طرف مائل ہوئے تو انھوں نے تمام اخلاقی حدود کو پھلانگ کر وحشت اور درندگی کی بدترین داستانیں رقم کیں۔ اگر ہم پاکستان بننے کے بعد ان مظالم کا جائزہ لیں جو خود مسلمانوں نے ہندووں اور سکھوں کے ظلم وستم سے بچ کر آنے والے اپنے مسلمان بھائیوں پر کیے تو ہمیں صحیح معنوں میں الحاد کے اثرات کا اندازہ ہوگا۔ دور جدید میں اس کا اندازہ محض روزانہ اخبار پڑھنے ہی سے ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ملحدین میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں، وہ تو انھوں نے پوری طرح اختیار کر لیں، لیکن ان کی خوبیوں کا عشر عشیر بھی ان کے حصے میں نہ آیا۔

الحاد کے معاشرتی اثرات میں ایک بڑا واضح اثر خاندانی نظام کا خاتمہ اور فری سیکس کا فروغ ہے۔ جنسی زندگی سے متعلق آداب انسان کو انبیاے کرام علیہم السلام ہی نے بتائے ہیں اور اس ضمن میں ہر قسم کی بے راہ روی کا خاتمہ کیا ہے۔ جب ایک شخص انھی کا انکار کر دے تو پھر اس کی راہ میں ایسی کون سی رکاوٹ ہے جو اسے دنیا کی کسی بھی عورت سے آزادانہ صنفی تعلقات سے روک سکے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پھر ماں، بہن اور بیٹی کا تقدس پامال کرنے میں بھی کیا حرج رہ جاتا ہے؟ اس کے بعد اگر نئی نئی لذتوں کی تلاش میں مرد مردوں کے پاس اور عورتیں عورتوں کے پاس جائیں تو اس میں کیا قباحت رہ جاتی ہے؟ الحاد کا یہ وہ اثر ہے جسے مغربی معاشروں میں پوری طرح فروغ حاصل ہوا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں اہل مغرب کی غلامی کے دوران میں خوش قسمتی سے مسلم دنیا الحاد کے ان اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رہی، لیکن بیسویں صدی کے ربع آخر میں میڈیا کے فروغ سے اب یہ اثرات بھی ہمارے معاشروں میں تیزی سے سرایت کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں یہ فری سیکس پھیل رہا ہے وہاں وہاں اس کے نتیجے میں ایک طرف تو ایڈز سمیت بہت سی بیماریاں پھیل رہی ہیں اور دوسری طرف خاندانی نظام کا خاتمہ بھی ہو رہا ہے، جس کے نتیجے میں کوئی نہ تو بچوں کی پرورش کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہے اور نہ بوڑھوں کی خبر گیری کرنے کو۔ کڈز ہومز میں پلنے والے یہ بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو اسی بے راہ روی کا شکار ہو کر یہ ذمہ داریاں قبول نہیں کرتے اور مکافات عمل کے نتیجے میں یہ جب بوڑھے ہوتے ہیں تو پھر ان کی خبر گیری کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ اچھے اولڈ ہومز میں داخلہ بھی اسی کو ملتا ہے جس کی اولاد کچھ فرماں بردار ہو اور اس اولڈ ہوم کا خرچ اٹھا سکے۔ ان کی زندگی اب کڈز ہوم سے شروع ہو کر اولڈ ہوم پر ختم ہو جاتی ہے۔

معاشرتی اور معاشی اعتبار سے الحاد نے مسلم معاشروں کو جس اعتبار سے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ دنیا پرستی کا فروغ ہے۔ دنیا پرستی کا فلسفہ مغربی اور مسلم، دونوں علاقوں میں پوری آب و تاب کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جب

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

انسان عملی اعتبار سے آخرت کی زندگی کا انکار کر دے یعنی اس کے تقاضوں کو مکمل طور پر فراموش کر دے تو پھر دنیاوی زندگی کی اس کی سرگرمیوں کا مطمح نظر بن جاتی ہے۔ مغربی معاشروں پر تو کسی تبصرے کی ضرورت نہیں، لیکن ہمارے اپنے معاشروں میں جس طرح دنیا پرستی کی بھیڑ چال شروع ہو چکی ہے، وہ ہماری پستی کی انتہا ہے۔ ایک طرف تو ایسے لوگ ہیں جن کی اخلاقی تربیت بہت ناقص ہے اور وہ ہر طرح کے جرائم میں مبتلا ہیں، لیکن ان کے برعکس ایسے لوگ جن کی اخلاقی قدریں کافی حد تک قائم ہیں، دنیا پرستی کے مرض میں کس حد تک مبتلا ہو چکے ہیں، اس کا اندازہ صرف ان کی چوبیس گھنٹے کی مصروفیات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگ جن کی اخلاقی سطح معاشرے کے عام افراد سے بلند ہے، روزانہ صبح اٹھتے ہیں اور اپنے کاروبار یا دفاتر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو دفتری اوقات کے فوراً بعد واپس آ جاتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ترقی کے لیے لیٹ سٹنگز کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور عام طور پر لوگ آٹھ نو بجے تک دفتر سے اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد گھر واپس آ کر کھانا کھانے، ٹی وی دیکھنے اور اہل خانہ سے کچھ گفتگو کرنے میں گیارہ بارہ بڑے آرام سے بج جاتے ہیں۔ سوتے سوتے ایک یا دو بج جاتے ہیں۔ بالعموم صبح کی نماز چھوڑ کر لوگ سات بجے تک بیدار ہوتے ہیں اور پھر دفتر کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ چھٹی کا دن عموماً ہفتے بھر کی نیند پوری کرنے اور گھریلو مسائل میں نکل جاتا ہے۔ اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ہم اللہ کو راضی کرنے، دین سیکھنے، اپنی اخلاقی حالت بلند کرنے اور دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کتنا وقت نکال سکتے ہیں؟ افسوس ہے کہ اس ترقی کو حاصل کرنے کے لیے جو زیادہ سے زیادہ بیس پچیس سال تک کام دے گی، ہم لامحدود سالوں پر محیط آخرت کی زندگی کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے کاروبار میں بیس روپے منافع کمانے کی دھن میں اربوں روپے کے سرمائے کا نقصان کر لے یا پھر دریا کی تہ میں پڑے ہوئے ایک روپے کے سکے کو حاصل کرنے کے لیے لاکھوں روپے کی دولت پھینک کر دریا میں چھلانگ لگا دے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الحاد کی سائنسی اساسات کا انہدام

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ الحاد کے عروج کا دور ہے۔ اسی دور میں وہ سائنسی تحقیقات ہوئیں جنھوں نے الحادی نظریات کی توجیہ پیش کی۔ اسی دور میں الحادی نظریات اور نظام ہائے حیات کو دنیا بھر میں فروغ ملا، اسی عرصے کے دوران میں دنیا بھر کے انسانوں نے اپنی زندگیوں میں مختلف درجوں پر الحاد کو قبول

کیا۔ کوئی الحاد کو نظریاتی طور پر بھی مان کر خالص ملحد اور دہریہ بنا اور کسی نے صرف اس کے عملی اثرات کو قبول کرنے پر اکتفا کیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر سے الحاد کا زوال شروع ہوا۔ دور قدیم کے ملحدین کے پاس الحاد کی کوئی ٹھوس منطقی دلیل نہیں ہوا کرتی تھی۔ انیسویں صدی میں کچھ ایسے سائنسی نظریات وجود میں آئے جنھوں نے الحاد کو کسی حد تک سپورٹ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں کسی کی حیثیت بھی سائنسی Law یا مسلمہ قانون کی نہیں تھی۔ یہ سب کے سب ابھی نظریے (Theory) کے درجے پر تھے۔ ان نظریات کا ایک مختصر جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں، یہاں ہم ہارون یحییٰ کے مضمون The Fall of Atheism سے ان سائنسی تحقیقات کا اجمالاً ذکر کریں گے جنھوں نے الحاد کی ان سائنسی بنیادوں کو منہدم کیا۔ ان نظریات میں ڈارون کا نظریۂ ارتقا فرائڈ کا نظریۂ جنس، مارکس اور اینجلز کے معاشی نظریات اور ڈرخم کے عمرانی نظریات شامل ہیں۔ جو صاحب ان کی تفصیل جاننا چاہیں، وہ اس آرٹیکل کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ آرٹیکل ان کی ویب سائٹ www.hyahya.org پر بھی میسر ہے۔ ان سائنسی اساسات کے انہدام پر جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر پیٹرک گلائن کا تبصرہ بڑا معنی خیز ہے:

''پچھلے دو عشروں کی ریسرچ نے جدید سیکولر اور ملحد مفکرین کی پچھلی نسل کے تمام مفروضات اور پیش گوئیوں کو گرا کر رکھ دیا ہے جو انھوں نے خدا کے وجود کے بارے میں قائم کیے تھے۔ جدید (ملحد) مفکرین نے یہ فرض کر رکھا تھا کہ سائنس پر مزید تحقیقات اس کائنات کو بے ترتیب (Random) اور میکانکی ثابت کر دیں گی، لیکن اس کے برعکس جدید سائنسی تحقیقات نے کائنات کو غیر متوقع طور پر ایسا منظّم نظام ثابت کیا ہے، جو کہ ایک ماسٹر ڈیزائن کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہو۔ ماڈرن (ملحد) ماہرین نفسیات یہ پیش گوئی کر رہے تھے کہ مذہب محض ایک دماغی خلل یا نفسیاتی بیماری ثابت ہو جائے گا، لیکن انسان کا مذہب کے ساتھ تعلق مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں دماغی صحت کا اعلیٰ ترین نمونہ ثابت ہوا ہے۔ اس حقیقت کو ابھی صرف چند لوگ ہی تسلیم کر رہے ہیں، لیکن یہ بات اب واضح ہو جانی چاہیے کہ مذہب اور سائنس میں ایک صدی کی بحث کے بعد اب پانسا مذہب کے حق میں پلٹ چکا ہے۔ ڈارون کے نظریے کے فروغ کے دور میں، ملحدین اور متشککین جیسے ہکسلے اور رسل یہ کہہ سکتے تھے کہ زندگی اتفاقی طور پر وجود میں آئی اور کائنات محض ایک اتفاق ہی سے بنی۔ اب بھی بہت سے سائنس دان اور دانش ور اسی نقطۂ نظر کو مانتے ہیں، لیکن وہ اس کے دفاع میں اب بے تکی باتیں کرنے پر ہی مجبور ہیں۔ آج حقائق کے مضبوط اعداد و شمار یہی ثابت کرتے ہیں کہ خدا کے موجود ہونے کا نظریہ ہی درست ہے۔''

(Patrick Glynn, God: The Evidence, The Reconciliation of Faith and Reason in a Postsecular World , Prima Publishing, California, 1997,۱۹۔۲۰،۵۳)

اب تک دنیا میں یہ مانا جا رہا تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس نظریے کو جدید دنیا میں جرمن فلسفی عمانویل کانٹ نے پیش کیا۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ اس کائنات کو کسی نے تخلیق نہیں کیا، بلکہ یہ ہمیشہ سے ایسے

ہی ہے۔ بیسویں صدی میں فلکیات (Astronomy) کے میدان میں جدید علمی تحقیقات نے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے دریافت کیا کہ کہکشائیں مسلسل ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہیں۔ اس سے سائنس دانوں نے یہ اخذ کیا کہ ماضی میں کسی وقت یہ کہکشائیں اکٹھی تھیں۔ اس وقت یہ کائنات توانائی کے ایک بہت بڑے گولے کی شکل میں موجود تھیں جو ایک بہت عظیم دھماکے (Big Bang) کے نتیجے میں مادے کی صورت اختیار کر گیا۔ ملحد مفکرین نے اس نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا، لیکن مزید سائنسی تحقیقات نے اس نظریے کو تقویت دی۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں دو سائنس دانوں ارنو پینز یاز اور رابرٹ ولسن نے دھماکے کے نتیجے میں بننے والی Cosmic Background Radiation کو دریافت کیا۔ اس مشاہدے کی تصدیق ۱۹۹۰ء میں Cosmic Background Explorer Satellite کے ذریعے سے کی گئی۔ اس صورت حال میں انتھونی فلیو جو کہ یونیورسٹی آف ریڈنگ میں فلسفے کے ایک ملحد پروفیسر ہیں، کہتے ہیں:

''اعتراف روح کے لیے اچھی چیز ہے۔ میں اس اعتراف سے آغاز کرتا ہوں کہ علم فلکیات میں اس اتفاق رائے سے ایک ملحد کے نظریات پر زد پڑتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فلکیات دان اس بات کو سائنسی طور پر ثابت کرنا چاہتے ہیں جو سینٹ تھامس فلسفیانہ طور پر ثابت نہ کر سکے یعنی یہ کہ اس کائنات کی کوئی ابتدا ہے۔ اس سے پہلے ہم یہ اطمینان رکھتے تھے کہ اس کائنات کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی اختتام... اب یہ کہنا بگ بینگ تھیوری کے سامنے آسان نہیں۔''

(Henry Margenau, Roy Abraham Vargesse, Cosmos, Bios, Theos, La Salle IL: Open Court Publishing 1992,۲۴۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جان میڈکس نے جو کہ ایک ملحد ہیں اور 'Nature' کے نام سے رسالہ نکالتے ہیں، اس نظریے کو اس بنیاد پر رد کر دیا کہ اس سے خدا کو ماننے والوں کو حجت مل جائے گی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ نظریہ دس سال سے زیادہ نہیں چل سکے گا، لیکن مزید تحقیقات نے اس نظریے کو اور تقویت دی۔ برطانوی ملحد اور ماہر طبیعات ایچ پی لپسن لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ قابل قبول تشریح یہی ہے کہ اس کائنات کو تخلیق کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ملحدین کی زبان بند کر دے گی جیسا کہ میرے ساتھ ہوا، لیکن ہمیں کسی چیز کو صرف اس بنیاد پر رد نہیں کر دینا چاہیے کہ ہم اسے پسند نہیں کرتے اگرچہ تجربہ اور مشاہدہ اسے ثابت کر رہا ہو۔''

(H.P.Lipson, "A Physicist Looks at Evolution", Physics Bulletin, 1980,۱۳۸/۱۳۸)

کائنات کے متعلق اہل الحاد کا ایک اور نظریہ بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ یہ کائنات بے ترتیب (Random) ہے۔ اس میں موجود مادے، اجرام فلکی اور جن قوانین کے تحت یہ چل رہے ہیں، ان کا کوئی مقصد نہیں، بلکہ یہ محض اتفاق ہی

ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں سائنس دانوں نے یہ دریافت کیا کہ کائنات میں ایسا توازن (Balance) پایا جاتا ہے جس میں اگر ذرا سا بھی ہیر پھیر ہو تو اس میں انسانی زندگی ممکن ہی نہ ہو سکے۔ تمام طبیعی، کیمیائی اور حیاتیاتی قوانین، کشش ثقل اور مقناطیسی قوتیں، ایٹمز اور مالیکیولز کی ساخت، عناصر اور مرکبات کی موجودگی یہ سب کا سب بالکل اسی طرح اس کائنات میں موجود ہے جیسا کہ انسانی زندگی کی ضرورت ہے۔ سائنس دانوں نے اس غیر معمولی ڈیزائن کو 'Anthropic Principle' کا نام دیا۔ ان کے مطابق اگر بگ بینگ کے وقت دھماکے کی شدت، مادے کے پھیلنے کی رفتار میں ذرا سا بھی فرق پڑ جاتا تو یا تو مادہ دوبارہ جڑ جاتا یا پھر اتنا زیادہ پھیل جاتا کہ موجودہ حالت میں کسی طور پر آ ہی نہ سکتا، اس طرح انسانی زندگی کبھی ممکن نہ ہوتی۔ زمین کا سائز، سورج کا سائز، سورج اور زمین کا فاصلہ، پانی کی طبعی اور کیمیائی خصوصیات، سورج کی شعاعوں کے طول موج (Wavelength)، زمین کی فضا میں موجود گیسیں اور کشش ثقل سب کی سب اسی تناسب میں موجود ہیں جو انسانی زندگی کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ اگر اس میں سے کسی میں $1/10^{39}$ کے برابر بھی فرق پڑ جاتا تو انسانی زندگی ممکن نہ ہوتی۔ کیا ایسا کسی مافوق الفطرت ہستی کی مداخلت کے بغیر ممکن تھا۔ کیا دنیا میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ ہوا میں ریت، بجری اور سیمنٹ کو یونہی اچھال دیا جائے اور وہ جب زمین پر بیٹھے تو ایک خوبصورت بنگلے کی صورت اختیار کر جائے جو انسانی رہایش کے لیے موزوں ترین ہو یا پھر روشنائی کے قطروں کو اچھال دیا جائے اور جب وہ نیچے گریں تو غالب کی غزل لکھی ہوئی ہو۔ شاید ایسا صرف کارٹون فلموں ہی میں ممکن ہے، لیکن حقیقی دنیا میں اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک منظّم نتیجہ حاصل کرنے کے لیے کسی برتر ہستی کی موجودگی ضروری ہوا کرتی ہے۔ ان حقائق نے بہت سے سائنس دانوں جیسے پال ڈیوس، ڈبلیو پریس، جارج گرین اسٹائن اور مالیکیولر بائیولوجسٹ مائیکل ڈینٹن کو کسی برتر ہستی کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ الحاد کو سب سے زیادہ سپورٹ ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے ملی ہے۔ ڈارون کے مطابق تمام جان دار اشیا بے جان مادے سے ایک ارتقائی عمل کے تحت بنی ہیں۔ سب سے پہلے ایک خلیے پر مشتمل سادہ جاندار وجود میں آئے اور پھر یہ لاکھوں سال میں نسل در نسل ارتقا پزیر ہو کر اعلیٰ جانوروں کی شکل اختیار کرتے گئے۔ بیسویں صدی میں پیلی انٹالوجی کے میدان میں قدیم ترین فوسلز پر ریسرچ سے نظریۂ ارتقا کسی طرح بھی ثابت نہ ہو سکا۔ یہ ریسرچ محض دو جانوروں کے درمیان ارتقائی کڑیوں کو جوڑنے میں ناکام رہی۔ اسی طرح جانوروں کی نسلوں میں کئی عشروں تک تبدیلیوں کے مطالعے سے سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی بھی نوع (Specie) میں

تبدیلیاں مخصوص جینیاتی حدود (Genetic Boundries) سے باہر نہیں جاتیں۔ انسانی آنکھ سے لے کر پرندوں کے پروں تک کسی بھی جان دار کے جسم کا ہر حصہ اتنی پیچیدہ ٹیکنالوجی (sophisticated technology) سے بنا ہوتا ہے کہ اس کا تقابل کسی بھی جدید مشینری سے کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ یہ سب کچھ محض اتفاق ہی سے اندھے قوانین کے تحت بن گیا۔ ان تمام تحقیقات کے نتیجے میں اب مغربی سائنس دانوں میں (Intelligent Design) کا نظریہ فروغ پا رہا ہے۔

نفسیات کے میدان میں الحاد کی اساسات سگمنڈ فرائڈ کے نظریات پر قائم تھیں جو کہ آسٹریا کے ماہر نفسیات تھے۔ فرائڈ مذہب کو محض ایک نفسیاتی بیماری قرار دیتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان جیسے جیسے ترقی کرے گا، یہ مرض دور ہو جائے گا۔ ماہرین نفسیات میں الحاد بہت تیزی سے پھیلا۔ ۱۹۷۲ء میں امریکن سائکالوجی ایسوسی ایشن کے ممبرز کے مابین ایک سروے کے مطابق ماہرین نفسیات میں صرف ایک اعشاریہ ایک فی صد ایسے تھے جو کسی مذہب پر یقین رکھتے ہوں۔ انھی ماہرین نفسیات نے طویل عرصے تک لوگوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو رائے قائم کی، وہ پیٹرک گلائن کے الفاظ میں کچھ یوں تھی:

''نفسیات کے میدان میں پچیس سالہ ریسرچ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ فرائڈ اور ان کے پیروکاروں کے خیال کے برعکس، مذہب پر ایمان ذہنی صحت اور خوشی کے اہم ترین اسباب میں سے ایک ہے۔ ریسرچ پر ریسرچ یہ ثابت کرتی ہے کہ مذہب پر ایمان اور اس پر عمل انسان کو بہت سے غیر صحت مندانہ رویوں جیسے خودکشی، منشیات کے استعمال، طلاق، ڈپریشن اور شادی کے بعد جنسی عدم تسکین سے بچاتا ہے۔ مختصراً، مشاہداتی ڈیٹا پہلے سے فرض کردہ سائیکوتھیراپک اجماع سے بالکل مختلف نتائج پیش کرتا ہے۔'' (Patrick Glynn, God: The Evidence, The Reconciliation of Faith and Reason in a Postsecular World, Prima Publishing, California, 1997, ۶۰-۶۱)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معاشیات کے میدان میں الحاد کی سب سے بڑی شکست کمیونزم کا زوال ہے۔ کمیونزم جو دنیا میں الحاد کا سب سے بڑا داعی تھا، بالآخر اپنے دو بنیادی مراکز روس اور چین میں دم توڑ گیا۔ لینن نے اپنے تئیں خدا کو سوویت یونین سے نکال دیا تھا، لیکن خدا نے اس کے غرور کا خاتمہ کر ہی دیا۔ کمیونزم کے آخری دور میں روسی عوام اور آخری صدر گورباچوف کو خدا کی ضرورت بری طرح محسوس ہوئی۔ سیاسیات کے باب میں الحاد کی بنیاد پر بننے والے نظریات فاشزم وغیرہ بھی دم توڑ گئے۔ معاشریات یا عمرانیات (Sociology) کے اعتبار سے الحاد اہل مغرب کو سکون فراہم کرنے میں ناکام رہا۔ یہ بے سکونی اس قدر بڑھی کہ وہاں ہپی تحریک نے فروغ پایا جو دنیا کی ذمہ داریوں سے جان چھڑا کر منشیات کے نشے میں مست پڑے رہتے اور سکون کی تلاش میں سرگرداں رہتے حتیٰ کہ بعض تو اسی حالت میں

اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو بیسویں صدی کی جدید سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں الحادی نظریات کی تردید میں آپ کے سامنے پیش کی گئیں۔ان میں سے اگر صرف کائنات کے توازن اور اس کے عین انسانی ضروریات کے مطابق ہونے ہی کو لیا جائے تو خدا کے وجود کا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔اس میں بعض چیزیں تو اتنی بدیہی ہیں کہ ان کو جاننے کے لیے کسی سائنسی تحقیق کی ضرورت نہیں، بلکہ دیہات میں رہنے والے عام انسان بھی ان کو سوچ اور سمجھ سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں تفصیلی سائنسی دلائل کے بجائے بالعموم ایسی چیزوں سے استدلال کیا گیا ہے جو ہر دور اور ہر ذہنی سطح کے لوگوں کی سمجھ میں آ جائیں۔دور جدید میں کائنات کا علم یعنی فلکیات ہو یا انسان کی اپنی ذات کا علم یعنی حیاتیات و نفسیات، جیسے جیسے انسان پر حقائق منکشف ہو رہے ہیں، وہ جانتا جا رہا ہے کہ واقعی اس کائنات کا خدا اور اس کا کلام حق ہے:

سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ. (حٰم السجدہ ۴۱: ۵۳)

''ہم عنقریب انھیں (انسانوں کو) اس کائنات اور خود ان کی ذات (جسم و روح) میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ (قرآن) حق ہے۔''

اس موقع پر ہم یہ عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ اثبات خدا سے متعلق سائنسی دلائل دیتے ہوئے ہمیں صرف ان چیزوں سے استدلال کرنا چاہیے جن کی حیثیت سائنس میں حتمی قانون (Law) یا مسلمات کی ہو۔اگر ہم بھی ملحدین کی طرح محض سائنسی نظریات (Theories) سے استدلال کرنے لگیں گے تو عین ممکن ہے کہ کل وہ نظریات بھی غلط ثابت ہو جائیں اور ہمارا استدلال غلط قرار پائے۔

الحاد، اکیسویں صدی اور ہماری ذمہ داریاں

جیسا کہ ہم نے مطالعہ کیا کہ انیسویں صدی میں جب سائنسی علوم نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ انسان ان کی بنیاد پر کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا، بعض خام سائنسی نظریات نے ملحدین کو خدا کا انکار کرنے کا جواز عطا کیا۔بیسویں صدی میں جب انسان کی علمی سطح بلند ہوئی تو اسے اپنے نظریات کی غلطی کا علم ہوا۔بہت سے ایسے حقانیت پسند ملحد مفکرین اور سائنس دانوں، جن میں پیٹرک گلائن بھی شامل ہیں، نے خدا کا اقرار کر لیا۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظریاتی میدان میں اب الحاد کو شکست حاصل ہو چکی ہے۔لیکن عملی میدان میں الحاد اب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے اور اس

ضمن میں مغربی اور مسلم دنیا کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ مغربی دنیا میں تو پھر بھی اخلاقی اصولوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، لیکن اس کے برعکس مسلم دنیا اخلاقی اعتبار سے بہت پیچھے ہے۔

اگر غور کیا جائے تو موجودہ دور میں صورت حال اتنی مایوس کن بھی نہیں ہے۔ ہمارے معاشروں میں تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ دین کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور بالخصوص ذہین لوگ بڑی کثیر تعداد میں دین کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ افراد کی اخلاقی حالت بھی بالعموم غیر تعلیم یافتہ افراد سے نسبتاً خاصی بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ اہل مغرب میں بھی دوبارہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا رجحان موجود ہے۔ یہ بات بعید از قیاس نہ ہوگی کہ جس طرح بیسویں صدی میں الحاد کو نظریاتی میدان میں شکست ہوئی، اسی طرح اکیسویں صدی میں انشاء اللہ الحاد کو عملی میدان میں بھی شکست ہونے کا خاصا امکان موجود ہے۔ اس ضمن میں جو لوگ اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ان پر بھی چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگر اہل ایمان ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو جاتے ہیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ عمل کے میدان میں بھی الحاد کو شکست ہو گی۔

اہل ایمان کو سب سے پہلے اپنا ہدف متعین کر لینا چاہیے۔ اس وقت جو لوگ دین کی خدمت کر رہے ہیں، ان کا ہدف بالعموم اتنا جامع اور متعین نہیں ہے۔ عام علما بس کسی طرح اپنے روایتی ورثے کی حفاظت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بعض دینی جماعتوں نے اپنا ہدف سیاسی نظام کی تبدیلی تک محدود کر لیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سیاسی نظام کی تبدیلی کے بعد کے مسائل پر کسی نے غور کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس کے لیے کوئی متعین لائحۂ عمل (Specific Action Plan) تیار کرنے کی کسی نے زحمت کی ہے۔ اگر یہ لوگ اسلام کی بنیاد پر دور جدید کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی ماڈلز تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ موجودہ حکمرانوں میں سے کوئی اسے نافذ کرنے پر تیار ہو جاتا۔ اس کے برعکس بعض دینی جماعتوں کا ہدف لوگوں کو چند مخصوص دینی اعمال جیسے نوافل، ورد و وظائف اور عبادات کی تلقین کرنا رہ گیا ہے۔ دین کا کلی تصور ان کے ہاں بھی مفقود ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دین شرک سب سے بڑا فتنہ تھا اور آپ کی دعوت کا بنیادی ہدف شرک کا خاتمہ تھا، اسی طرح موجودہ دور میں ''الحاد عملی'' سب سے بڑا فتنہ اور اس کا خاتمہ اہل ایمان پر لازم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی دوسرے مذہب سے اتنا بڑا خطرہ لاحق نہیں ہے جتنا کہ الحاد سے جو دنیا پرستی اور اخلاقی انحطاط کی صورت میں ملت اسلامیہ کے قلب میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ آج کی ہر دینی جدوجہد کا بنیادی ہدف اس الحاد کی جڑ پر تیشہ چلانا ہونا چاہیے۔

یہ حقیقت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اب تک اسلام پسند افراد اور تحریکیں الحاد کی بنیاد پر قائم ہونے والے نظریات جیسے جمہوریت، سیکولرازم اور کیپیٹل ازم وغیرہ کے اسلامی بنیادوں پر قائم مربوط اور ترقی یافتہ متبادل پیش نہیں کر سکے۔ اس وقت اس چیز کی ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیمات کی اساس پر دور جدید کے تقاضوں کے مطابق قابل عمل سیاسی، معاشی اور عمرانی ماڈلز تیار کیے جائیں اور امت کے ذہین ترین افراد علوم اسلامیہ میں اجتہادی بصیرت پیدا کر کے اس عمل میں حصہ لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا حصول بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ پوری امت کے مزاج کو علمی اور معقولیت پسند (Rational) بنانے کی ضرورت ہے جیسا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور آج کل کے اہل مغرب کا مزاج علمی اور عقلی ہے۔ تاریخ میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جب ہم علم و دانش کی بلندیوں کو چھو رہے تھے اور اہل مغرب علم و دانش سے کوسوں دور تھے تو ہمارا دور عروج تھا اور جب ہم علم و دانش سے دور ہوئے اور اہل مغرب نے اسے اختیار کیا تو دنیا میں ان کا عروج اور ہمارا زوال شروع ہوا۔

اہم ترین ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ امت مسلمہ کے اخلاق و کردار کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کی جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملحدین کے بجائے مسلمان خود کو عملی طور پر اعلیٰ انسانی اخلاقیات کا چیمپئن ثابت کریں۔ اس ضمن میں نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا خود جائزہ لیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ امت مسلمہ سے باہر ہمارا کیا تاثر پایا جاتا ہے۔ اس میں کیا کیا منفی عوامل شامل ہیں؟ ہم میں ایسی کون سی حقیقی کمزوریاں موجود ہیں جو غیر مسلموں کی نظر میں ہمارے امیج کو خراب کرتی ہیں؟ کیا ہم اسلام کے حقیقی داعی اور مبلغ کا کردار ادا کر رہے ہیں یا ہماری حیثیت بھی بہت سی قوموں کے ہجوم میں محض ایک عام سی قوم کی ہے جو سب کی طرح صرف اپنے ہی حقوق کے لیے مری جا رہی ہو؟ اپنی اخلاقی کمزوریوں کو دور کر کے ایک داعی و مبلغ کا اعلیٰ ترین کردار پوری دنیا کے سامنے پیش کرنا بہت بڑا اجہاد ہے جس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اس تنقید کا مطالعہ بہت ضروری ہے جو ملحدین اور دوسرے غیر مسلم مفکرین نے مسلمانوں کے کردار پر کی ہے۔

اگر ان خطوط پر کام کیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ ہم آنے والے دور میں الحاد کا بہتر مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

سلیمان بن یسار

سلیمان بن یسار کی ولادت ایرانی نژاد یسار کے ہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے اواخر میں ہوئی۔ وہ ام المومنین حضرت میمونہ ہلالیہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے اور ان کو بدل کتابت ادا کر کے آزاد ہوئے اس لیے ہلالی کہلاتے تھے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ سیدہ میمونہ نے سلیمان کی ولایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو سونپ دی تھی۔ سلیمان مدینہ کے مفتی تھے اور ان کا شمار اس شہر کے سات بڑے فقیہوں (فقہاے سبعہ) میں ہوتا تھا، اس اعتبار سے ان کی نسبت مدنی تھی۔ ان کی کنیت ابوایوب، ابوعبدالرحمان اور ابوعبداللہ بیان کی گئی ہے۔ سلیمان کے تین بھائی عطا، عبدالملک اور عبداللہ تھے، سب نے حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام روایت کی، ان میں سے عطا بن یسار زیادہ مشہور ہوئے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سلیمان کثیر الحدیث تھے۔ انھوں نے امہات المومنین سیدہ عائشہ، سیدہ ام سلمہ اور سیدہ میمونہ سے، جلیل القدر صحابہ حضرت جابر بن عبداللہ، حسان بن ثابت، حمزہ بن عمرو، رافع بن خدیج، زید بن ثابت، عبداللہ بن حارث بن نوفل، عبداللہ بن عمر، مقداد بن اسود، ابوسعید خدری، عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ، مسعود بن حکم، ابوواقد لیثی، ربیع بنت معوذ، سلمہ بن صخر، فاطمہ بنت قیس، عبداللہ بن عباس اور ابو رافع سے اور تابعین میں سے عبد اللہ بن عیاش، عبدالرحمان بن جابر، عبدالملک بن یسار، جعفر بن عمرو، عراک بن مالک، عروہ بن زبیر، کریب، مالک بن ابوعامر، مسلم بن سائب، ابوعبداللہ مدنی، ابومرواح اور عمرہ بنت عبدالرحمان سے حدیث روایت کی۔

ان سے حدیث رسول سیکھنے والوں میں یہ بڑے بڑے نام ہیں: ان کے بھائی عطا بن یسار، اسامہ بن زید، بکیر

بن اشج ، ربیعہ الراے، جعفر بن عبداللہ، حارث بن عبدالرحمان ،حاضر بن مہاجر، خالد بن ابوعمران، خثیم بن عراک ، ربیعہ بن ابوعبد الرحمان ، زید بن اسلم ، سالم ابوالنضر ، سعید بن زیاد ، صالح بن سعید، صالح بن کیسان ، عبداللہ بن فضل ، عبداللہ بن ابوبکر، عبداللہ بن دینار ، عبداللہ بن ذکوان ، عبداللہ بن سعد ، عبداللہ بن فیروز ، عبداللہ بن یزید، عبد الرحمان بن یزید، عمرو بن دینار، عمرو بن شعیب، عمرو بن میمون ، عمران بن ابوانس ،محمد بن ابوحرملہ، محمد بن عبدالرحمان بن عبید، محمد بن عبدالرحمان بن نوفل، محمد بن عمرو، ابن شہاب زہری، محمد بن یوسف، مکحول ، نافع ، یحییٰ بن ابواسحاق ، یحییٰ بن سعید، یزید بن ابوحبیب ، یعقوب بن عتبہ، یعلیٰ بن حکیم، یونس بن یوسف اور سلیمان کے بیٹے عبداللہ بن سلیمان ۔

سلیمان بن یسار کو ثقہ اور حجت مانا جاتا تھا۔ زہری کہتے ہیں: ''ان کا شمار (بڑے) علما میں ہوتا تھا''۔ ابوزناد کے والد ذکوان کہتے ہیں: ''میری ملاقات مدینے کے جن عالموں اور فقیہوں سے ہوئی ، ان میں حسب ذیل لوگ ایسے تھے جنھیں پسند کیا جاتا اور ان کے قول کو سند مانا جاتا تھا: سعید بن مسیّب ، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوبکر بن عبد الرحمان مخزومی ، خارجہ بن زید، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ اور سلیمان بن یسار۔ یہ اصحاب جو فقہاے سبعۂ مدینہ کے نام سے جانے جاتے ہیں، شرف و مرتبے میں ہم عصر علما، فقہا اور صلحا سے ممتاز تھے۔''

سلیمان بن یسار علم و فضل میں اس درجہ فائق تھے کہ کچھ اصحاب رجال نے انھیں سعید بن مسیّب پر فوقیت دی ہے۔ حسن بن محمد کا کہنا ہے: ''ہمارے خیال میں سلیمان سعید بن مسیّب سے زیادہ فہم و قیاس رکھتے تھے''۔ سلیمان اور سعید کی باہمی قدر دانی سے لگتا ہے کہ دونوں ہی بلند پائے کے عالم و فاضل تھے۔ عبداللہ بن یزید ہذلی بیان کرتے ہیں: ''میں نے سلیمان بن یسار کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''سعید بن مسیّب زندہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر فضیلت رکھتے ہیں۔'' دوسری طرف میرا یہ مشاہدہ بھی ہے کہ ایک آدمی سعید بن مسیّب سے فتویٰ لینے آیا تو انھوں نے فرمایا: ''سلیمان بن یسار کے پاس جاؤ، وہ آج کے زندہ لوگوں میں سب سے بڑے عالم ہیں۔'' امام مالک فرماتے ہیں: ''سعید بن مسیّب کے بعد سلیمان بن یسار بڑے علما میں سے تھے۔ ان کی رائے عام طور پر سعید کی رائے سے موافق ہوتی۔ سعید بن مسیّب سے تو کم ہی اختلاف کیا جاتا۔'' قتادہ بیان کرتے ہیں: ''میں مدینہ گیا اور وہاں کے شہریوں سے دریافت کیا، یہاں طلاق کے معاملات کا سب سے بڑا ماہر کون ہے؟ جواب تھا سلیمان بن یسار''۔

جب ولید بن عبدالملک نے عمر بن عبدالعزیز کو مدینے کا گورنر مقرر کیا تو انھوں نے ظہر کی نماز پڑھاتے ہی شہر کے دس فقہا سعید بن مسیّب ، عروہ بن زبیر، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، ابوبکر بن عبدالرحمان مخزومی ، ابوبکر بن سلیمان ، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ اور خارجہ بن زید کو بلایا۔ حمد و ثنا کے بعد انھوں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نے فرمایا: ''میں نے آپ سب کو ایک ایسے کام کے لیے بلایا ہے جس کا آپ کو اجر ملے گا اور آپ حق کے مددگار بھی بن جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں آپ کے مشورے اور آپ میں سے موجود لوگوں کی رائے کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کروں۔ اگر آپ میں سے کوئی کسی اہل کار کو ظلم کرتا دیکھے یا اسے کسی عامل کی زیادتی کی شکایت ملے تو میں اس اطلاع پانے والے کو اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے ضرور خبر کرے۔'' ابن سعد کی روایت کے مطابق عمر ثانی نے سلیمان کو مدینے کے بازار کے امور کا نگران مقرر کیا۔

سلیمان مونچھیں اتنی چھوٹی کر دیتے کہ لگتا کہ منڈائی ہوئی ہیں۔ انتہائی خوبرو جوان تھے۔ ایک عورت نے ان کو بہکانے کی کوشش کی تو اسے گھر میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ کہتی رہ گئی کہ میں تجھے رسوا کر دوں گی۔ حامل علم ہونے کے ساتھ سلیمان عابد و پرہیز گار بھی تھے۔ اکثر روزے سے رہتے۔ انھوں نے دمشق کا سفر بھی کیا اور یزید بن جابر کے مہمان ہوئے۔

ہیثم بن عدی کہتے ہیں کہ سلیمان ۱۰۰ھ میں فوت ہوئے۔ حاجی خلیفہ کا کہنا ہے کہ ان کا انتقال ۱۰۴ھ میں ہوا۔ کچھ مورخین نے سلیمان کا سن وفات ۹۴ھ متعین کیا ہے، اسی سال سعید بن مسیّب، علی بن حسین زین العابدین اور ابوبکر بن عبدالرحمان مخزومی نے وفات پائی، اس لیے یہ عام الفقہا کے نام سے مشہور ہے۔ حافظ ذہبی نے اسے قطعاً غلط قرار دیا ہے، انھوں نے سلیمان کی تاریخ پیدایش ۳۴ھ اور ان کی عمر ۷۳ برس متعین کر کے ابن سعد، یحییٰ بن معین اور بخاری کی رائے کو اختیار کیا، یوں سن وفات ۱۰۷ھ بنتا ہے۔ ابن حبان کا کہنا ہے کہ سلیمان کی تاریخ پیدایش ۲۴ھ ہے۔

امام بخاری نے سلیمان بن یسار نامی دو اور اصحاب کا ذکر ''تاریخ کبیر'' میں کیا ہے۔ ایک مدنی جنھوں نے ابن بلال اور ابن ابوذئب سے حدیث روایت کی، دوسرے حضرمی جن سے صفوان بن عمرو نے روایت کی۔

مطالعۂ مزید: طبقات ابن سعد، تاریخ البخاری الکبیر، تہذیب الکمال (مزی)، وفیات الاعیان (ابن خلکان)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)، تاریخ الاسلام، سیر اعلام النبلا (ذہبی)۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وسیم اختر مفتی

قاسم بن محمد

دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایران کے جنگی قیدی مدینہ لائے گئے، آخری ایرانی بادشاہ یزدگرد کی تین بیٹیاں بھی ان میں شامل تھیں۔ اس زمانے کے جنگی قانون کے مطابق قیدیوں کی فروخت ہوئی تو حضرت عمر نے ان تینوں کو بھی بیچنے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا: شاہ زادیوں سے عام عورتوں والا سلوک نہ کیا جائے۔ خلیفۂ ثانی نے سوال کیا، تو ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟ حضرت علی کا جواب تھا، ان کی قیمت لگوائی جائے اور جو قیمت بھی ہو دے کر وہ شخص ان کا نگران بن جائے جو انھیں پسند کر لے۔ چنانچہ ان کی قیمت لگی اور خود حضرت علی نے ان کی ذمہ داری اٹھا لی۔ اپنی تحویل میں آنے کے بعد انھوں نے ایک شہزادی عبداللہ بن عمر کو ہبہ کر دی، دوسری اپنے بیٹے حضرت حسین کو دی اور تیسری کو اپنے پاس پرورش پانے والے محمد بن ابوبکر صدیق کی ملکیت میں کر دیا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ تینوں کے ہاں پیدا ہونے والے بیٹے نامور اور نمایاں حیثیت کے حامل ہوئے۔ عبداللہ بن عمر کے ہاں سالم نے جنم لیا، حضرت حسین کے بیٹے علی امام زین العابدین کے نام سے مشہور ہوئے اور محمد بن ابوبکر صدیق کے ہاں قاسم کی پیدایش ہوئی۔ یہ تینوں نامور تابعی جو خالہ زاد بھائی تھے اور جن کی مائیں یزدگرد کی بیٹیاں تھیں فہم دین اور تقویٰ میں مثال سمجھے جاتے ہیں۔

قاسم بن محمد حضرت علی کے دور خلافت میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ وہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق کے پوتے تھے۔ ان کی والدہ کا اسلامی نام سودہ تھا۔ ۳۸ھ میں قاسم کے والد محمد بن ابوبکر کو قتل کر دیا گیا تو وہ اپنی پھوپھی ام المومنین حضرت عائشہ کی پرورش میں آ گئے۔ قاسم کی کنیت ابومحمد اور ابوعبدالرحمان تھی۔ قاسم بن محمد کا

شمار عالی قدر تابعین میں ہوتا ہے۔ابن سعد نے ان کو تابعین مدینہ کے دوسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔آسمان علم کے یہ چمکنے والے ستارے مدینے کے فقہاے سبعہ میں سے ایک تھے۔

قاسم بن محمد نے بہت سے صحابہ سے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم روایت کی اور خود ان سے بڑے بڑے تابعین نے درس حدیث لیا۔جن اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین کرام سے قاسم نے خوشہ چینی کی، ان کے نام یہ ہیں: حضرت عمر کے آزاد کردہ غلام اسلم، رافع بن خدیج، صالح بن خوات، عبداللہ بن جعفر بن ابوطالب، عبداللہ بن زبیر بن عوام، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور ان کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عبدالرحمان بن ابوبکر صدیق، عبداللہ بن عمرو بن عاص، عبدالرحمان بن یزید، مجمع بن یزید، معاویہ بن سفیان، ابوہریرہ، ام المومنین زینب بنت جحش، فاطمہ بنت قیس، قاسم کے والد محمد بن ابوبکر صدیق، اور ان کی پھوپھی ام المومنین عائشہ صدیقہ۔

قاسم سے استفادۂ حدیث کرنے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔کتب احادیث کی اسناد سے معلوم ہونے والے نام حسب ذیل ہیں: اسامہ بن زید بن اسلم، اسامہ بن زید لیثی، اسماعیل بن ابوحکیم، افلح بن حمید، انس بن سیرین، ایمن بن نابل، ایوب سختیانی، ثابت بن عبید، جعفر صادق، حمید طویل، حنظلہ بن ابوسفیان، حضرمی بن لاحق، خالد بن ابوعمران، ربیعہ بن ابوعبدالرحمان، ربیعہ بن عطا، سالم بن عبداللہ بن عمر، سعد بن ابراہیم، سعد بن سعید، سلیمان بن عبدالرحمان، سلیمان بن موسیٰ، شیبہ بن نصاح، عامر شعبی، صالح بن کیسان، محمد بن منکدر، صالح بن ابو مریم، طلحہ بن عبدالملک، عاصم بن عبیداللہ، عباد بن منصور، ابوزناد، عبداللہ بن عبیداللہ، عبداللہ بن عون، عبد بن علا، عبدالرحمان بن عمار، عبدالرحمان بن قاسم بن محمد، عبیداللہ بن ابوزیاد، عبیداللہ بن عبدالرحمان، عبیداللہ بن عمر، عبیداللہ بن مقسم، عبیس بن میمون، عثمان بن مرہ، عکرمہ بن عمار، عمارہ بن غزیہ، عمر بن سعید، عمر بن عبداللہ، عمرو بن عثمان، عمران بن عبداللہ عیسیٰ بن میمون، ابونہیک، مالک بن دینار، محمد بن عبدالرحمان، محمد بن عثمان، محمد بن عقبہ، ابن شہاب زہری، مظاہر بن اسلم، منذر بن عبید، موسیٰ بن سرجس، نافع، یحییٰ بن سعید، ابوبکر بن محمد، ابوعبید، ابوعثمان انصاری اور ابن سخبرہ۔

امام بخاری کہتے ہیں کہ قاسم سے دوسو حدیثیں مروی ہیں۔عبداللہ بن عون کہتے ہیں کہ قاسم بن محمد، ابن سیرین اور رجا بن حیوہ الفاظ کی صحت کا خیال کرتے ہوئے احادیث رسول روایت کرتے تھے جبکہ حسن، ابراہیم اور شعبی روایت بالمعنی سے کام لیتے تھے۔سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں: ''حضرت عائشہ کی بیان کردہ روایات کو تین افراد بخوبی

جانتے تھے، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر اور عمرہ بنت عبدالرحمان۔'' علم روایت کے مشہور نقاد یحییٰ بن معین کا کہنا ہے:
''عن عبیداللہ بن عمر عن قاسم بن محمد عن عائشہ روایت کی سنہری کڑی ہے۔''

قاسم خود بتاتے ہیں: ''حضرت عائشہ نے خلفاے راشدین کے زمانے سے فتویٰ دینا شروع کیا، ان کی وفات تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ میں اس عرصہ میں ان کے ساتھ رہا، میں بحر علوم عبداللہ بن عباس کے ہم نشین رہا اور ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمر کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا رہا۔ ابن عمر بہت پرہیز گار تھے، وسیع علم رکھنے کے باوجود اسی معاملے میں بولتے جس کا انھیں بخوبی علم ہوتا۔'' ابو زناد کہتے ہیں: ''میں نے ان سے بڑا عالم سنت نہیں دیکھا، اس زمانے میں عالم اسے ہی سمجھتے تھے جو عالم سنت ہوتا۔ قاسم بن محمد کا ذہن بہت تیز تھا، وہ مسائل میں شبہ ڈالنے والوں کا جواب مزاحیہ انداز میں دیتے۔'' خلیفۂ حجاز عبداللہ بن زبیر کے بھائی خالد ان کے پاس بیٹھے تھے کہ کسی کام سے قاسم بن محمد ان کے پاس آئے، اپنی بات کر کے پلٹے تو عبداللہ نے خالد سے کہا: ''میرے خیال میں ابو بکر کا کوئی بیٹا اس نوجوان سے زیادہ اپنے باپ سے مشابہ نہیں۔'' یحییٰ بن سعید کہتے ہیں: ''ہمیں کوئی شخص ایسا نہیں ملا جسے ہم قاسم بن محمد پر ترجیح دے سکیں۔'' امام مالک فرماتے ہیں: ''قاسم اس امت کے فقہا میں سے ہیں۔'' ابن سیرین کا جسم بھاری ہو گیا اور ان کے لیے حج پر جانا ممکن نہ رہا۔ جو حج پر جاتا اسے کہتے: ''قاسم بن محمد کے طور طریقوں، ان کے لباس اور رہن سہن کو دیکھنا۔'' لوگ ان کو آ کر بتاتے تو وہ قاسم کی پیروی کرتے۔ امام مالک کی روایت ہے کہ مدینے کا کوئی حاکم قاسم کے پاس آیا اور کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا: ''انسان اپنی عزت تبھی بنا سکتا ہے، اگر وہی بات کرے جو جانتا ہو۔'' قاسم کا ایک شخص سے کسی شے میں جھگڑا ہو گیا تو انھوں نے اس کو جواب دیا: ''تم اس چیز کی ملکیت کے بارے میں مجھ سے جھگڑا کرنا چاہتے ہو۔ اگر حقیقت میں یہ تمھاری ہے تو تم لے لو، میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ میری ہے تو میں تمھارے لیے حلال قرار دیتا ہوں، تم اسے اپنی ملکیت سمجھو۔'' قاسم مجلس میں کسی کی بات رد کرتے، نہ اس کی عیب جوئی کرتے۔ وہ خوش لباس تھے، باریک قمیض اور ریشمی چغہ بھی پہن لیتے، سر پر سفید عمامہ رکھتے، ان کی مونچھیں قدرے بڑی تھیں، سر اور داڑھی پر مہندی لگاتے۔ ان کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس پر ان کا نام قاسم بن محمد نقش تھا۔

اگرچہ تاریخ میں قاسم بن محمد کے تفقہ کی تفصیل ملتی ہے، نہ اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ان کا امتیازی وصف کیا تھا جس کی بنیاد پر ان کو فقہاے سبعۂ مدینہ میں شمار کیا گیا، لیکن قیاس ہے کہ عروہ بن زبیر کی طرح قاسم بھی فقہی مسائل پر عمومی گرفت کے ساتھ حضرت عائشہ کی روایات اور ان کے فتاویٰ پر عبور رکھتے تھے اور یہی ان کا تخصص رہا ہوگا۔ اپنے اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ظن کی تائید کے لیے مولف کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ عروہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے جبکہ قاسم بن محمد ان کے بھتیجے تھے اور یہ دونوں براہ راست ان کی تربیت میں رہے۔ لامحالہ دونوں پر حضرت عائشہ کے تفقہ کا اثر رہا ہوگا اور یہی ان کے فتاویٰ میں جھلکتا ہوگا۔ البتہ، عروہ کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے مغازی کے بارے میں کتاب تحریر کی، وہ مسجد نبوی میں درس دیتے جس میں کثیر حاضری ہوتی اور کئی بار صحابہ نے بھی ان سے فقہی استفسارات کیے۔ سیدہ عائشہ کے بعد قاسم پر عبدلین ابن عمر اور ابن عباس کے خیالات کا اثر نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ قاسم صبح سویرے اپنے گھر سے مسجد میں آتے، دو رکعت نماز پڑھ کر لوگوں کے بیچ بیٹھ جاتے جوان سے اپنے استفسارات کرتے، عشا کی نماز کے بعد دوستوں اور شاگردوں کے حلقے میں بیٹھنا بھی ان کا معمول تھا۔ مسجد نبوی میں ان کی نشست آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور قبر کے درمیان ہوتی۔ یہیں سالم بن عبداللہ، عبدالرحمان بن قاسم، عبیداللہ بن عمر اور پھر امام مالک بیٹھتے رہے۔ سعید بن مسیّب کی طرح قاسم کی دل چسپی بھی فقہی آرا اور روایات سے خاص تھی، تفسیر قرآن ان کا مضمون نہ تھا، اس پر گفتگو نہ کرتے۔ کوئی مسئلہ پوچھتا تو اپنی رائے ضرور ظاہر کرتے، لیکن اسی کے حق ہونے پر اصرار نہ کرتے۔ قدریوں کو اچھا نہ سمجھتے، کچھ لوگوں کو تقدیر پر بحث کرتے دیکھا تو کہا: ''جس مسئلے پر اللہ نے کلام نہیں کیا، تم بھی اس پر گفتگو کرنے سے باز رہو۔'' قاسم بن محمد عمر بن عبدالعزیز کی دس افراد پر مشتمل مجلس مشاورت میں بھی شامل تھے۔ حجاز کی گورنری کے زمانے میں امور مملکت چلانے کے لیے انھوں نے یہ مجلس ترتیب دی تھی۔ اس میں فقہاے سبعہ (سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، خارجہ بن زید، عبیداللہ بن عبداللہ، قاسم بن محمد، ابوبکر بن عبدالرحمان اور سلیمان بن یسار) کے علاوہ ابوبکر بن سلیمان، سالم بن عبداللہ اور عبداللہ بن عامر شامل تھے۔ پانچویں خلیفۂ راشد ہونے کے بعد اکثر اس خواہش کا اظہار کرتے: ''کاش خلافت قاسم کو ملی ہوتی۔''

قاسم کے والد محمد بن ابوبکر نے خلیفۂ ثالث، شہید مظلوم حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین کی شہادت میں شریک ہو کر ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا، اس کا قلق قاسم کو عمر بھر رہا۔ وہ اکثر سجدے میں گر کر دعا مانگتے: ''اے اللہ، میرے باپ کا گناہ معاف کر دے جو اس نے حضرت عثمان کے باب میں کیا تھا۔'' قاسم کی شادی اپنی چچازاد قریبہ بنت عبدالرحمان بن ابوبکر سے ہوئی۔ ان کی اولاد میں سے عبدالرحمان، ام فروہ، ام حکیم اور عبدہ کے نام معلوم ہیں۔ عبدالرحمان نے بھی روایت حدیث میں اہم حصہ لیا۔ آخری عمر میں قاسم کمزور ہو گئے تھے، ایام حج میں مسجد بھی سواری پر آتے پھر ان کی بینائی زائل ہو گئی۔ ان کا انتقال عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے ایک سال بعد مکہ اور مدینہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے راستے میں قدید کے مقام پر ہوا۔ان کا سن وفات متعین کرنے میں مورخین نے اختلاف کیا ہے، کچھ نے ۱۰۵ھ، کچھ نے ۱۰۷ھ اور باقیوں نے ۱۰۸ھ تحریر کیا ہے۔قاسم نے وصیت کی: ''مجھے انھی کپڑوں میں دفن کیا جائے جن میں میں نماز پڑھا کرتا تھا، میری قمیض، میرا پاجامہ اور میری چادر۔'' ان کے بیٹے نے پوچھا: ''کیا ہم دو کپڑوں سے زیادہ نہ کر لیں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''(میرے دادا) ابوبکر اسی طرح تین کپڑوں میں دفنائے گئے تھے۔مردے سے زیادہ زندہ انسانوں کو نئے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' ان کی عمر ستر یا بہتر برس ہوئی۔

مطالعۂ مزید: طبقات ابن سعد، تہذیب الکمال (مزی)، وفیات الاعیان (ابن خلکان)، ربیع الابرار (زمخشری)، سیر اعلام النبلا (ذہبی)۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مرزا آصف رسول

سورۂ اقرا

سورۂ اقرا کی منظوم ترجمانی

رحیم و رحمان حق تعالیٰ کے اسم عالی سے ابتدا ہے
پڑھو پیمبر! سنا دو پڑھ کے
خداے واحد کے نام سے جو
تمھارا رب ہے
جو خالقیت کی داستاں میں
عظیم تر ہے
حقیر خوں کی ذرا سی پھٹکی سے بننے والا
یہ ابن آدم
اسی کی تخلیق کا ثمر ہے
جو خود کو عالی نسب سمجھ کر
بہت ہی مغرور ہو چلا ہے
اسی تفاخر میں رب کے یوم نشور کو بھی
بھلا چکا ہے

سمجھ رہا ہے
وہ اس جہاں میں عبث ہی تخلیق ہو گیا ہے
وہ سوچتا ہے
کہ جب وہ مر کے
زمیں کے نیچے
زمیں کا حصہ ہی بن رہے گا
تو کب پھر اس کو جلا ملے گی؟
کہاں عمل کی جزا ملے گی؟
اسے بتا دو
سنا دو پڑھ کے
اور اصل یہ ہے
کہ وہ خدا جو تمھارا رب ہے
وہ اپنی خوے کریم نفسی میں خوب تر ہے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسی کریمی کا تو ثمر ہے
کہ علم اس نے
قلم کے رشتے سکھا دیا ہے
کتاب رشد و ہدیٰ کی صورت
بشر کو وہ سب بتا دیا ہے
جسے وہ اب تک نہ جانتا تھا
مگر تحیر کی انتہا ہے
کہ ابن آدم گریز پا ہے
اٹل مسلم حقیقتوں سے
خدا کی مطلق صداقتوں سے
کسی مفر کی تلاش میں ہے
کبھی بہانے تراشتا ہے
کبھی فسانے تلاشتا ہے
نہیں یہ ہرگز نہیں پیمبر!
یہ انحراف اس لیے نہیں ہے
کہ اس کے ذہن رسا کی وسعت سے یہ حقائق
بہت وراء ہیں
جفا کی دنیا کا سچ تو یہ ہے
کہ ابن آدم
بغاوتوں کی روش پہ اصرار کر رہا ہے
وہ اپنے طغیان و سرکشی میں
ہر ایک در سے گزر چلا ہے
ذرا سا مال و منال پا کر
وہ خود کو اوروں سے بے نیاز و غنی تصور کیے ہوئے ہے
اسی لیے تو اکڑ رہا ہے
خدا فراموش بن گیا ہے
مگر اسے یہ پتا نہیں ہے
کہ آخر اس کو
خدا کی جانب ہی لوٹنا ہے
تمھارے رب کے حضور رجعت
یہی قضا ہے

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com